© rasailojaraid.com

مصر میں عربوں کی آمد اور انتظامی نظم ونسق

محمد انس حسان*

شام وعراق کی فتح کے بعد جب مسلمانوں نے گردوپیش پر نگاہ ڈالی اور سیاسی حالات کا مطالعہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ اگر ان فتوحات کو محفوظ رکھنا ہے تو آگے بڑھے بغیر چارہ نہیں۔ شام کو فتح کر کے مصر کی طرف سے بے فکر رہنا سیاسی خودکشی کے مترادف تھا۔ اس کے علاوہ گو عربوں نے بازنطینی حکومت کے بہترین ایشیائی صوبوں پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن اس حکومت کی طرف سے خطرہ زائل نہیں ہوا تھا۔ بازنطینی سلطنت کا بحری اور فوجی مرکز قلزم حجاز سے اس قدر قریب تھا کہ جب تک مصر فتح نہ ہو جائے اور قلزم پر مسلمانوں کا مستقل قبضہ نہ ہو حجاز کو محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ اس سے بھی قطع نظر سال کے چار مہینے قسطنطنیہ کا گزارا مصر کی زرعی پیداوار پر تھا (۱) اور ضروری تھا کہ ایک طرف تو سلطنت کے معاشی حالات پر اثر ڈالا جائے اور دوسری طرف اس تمام زرعی پیداوار سے خود مسلمان فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ ۱۸ھ میں مصر ہی کے غلے سے حجاز کی قحط زدگی کو دور کیا گیا۔ (۲)

روایات کے مطابق اسلام سے قبل حضرت عمرو بن العاصؓ ایک مرتبہ مصر آئے تھے اور تمام مصر میں سے گذر کر اسکندریہ پہنچے تھے جہاں انھوں نے کچھ مدت قیام کیا تھا۔ اسکندریہ کا شہر انھوں نے خوب دیکھا تھا اور وہاں کی عظیم الشان عمارتوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ (۳) اتنا تو صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے مصر میں آنے اور وہاں سے باہر جانے کے راستے پوری طرح دیکھے تھے، مگر یہ بھی ناممکن ہے کہ اس سفر کے دوران میں ان جیسا بالغ نظر اور تیز فہم شخص مصر کے عام حالات سے بے خبر رہا ہو۔ اس طرح حضرت عمرو بن العاصؓ کو مصر سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور تھی۔ پھر عمرو بن العاصؓ ان چار اصحاب میں سے تھے جنھیں حضرت ابو بکرؓ نے اسلامی فوج کا افسر بنا کر فتح شام کے لئے بھیجا تھا۔ اس فتح کے دوران میں بھی وہ مصر اور شام کے گہرے سیاسی تعلق سے ناواقف نہ رہے ہوں گے اور انھیں اس کا بھی بخوبی علم ہو گا کہ قیصر ہرقل نے شام کی حفاظت کی غرض سے مصر کی تمام رومی فوجیں وہاں سے ہٹا کر شام میں جمع کر دی ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے وہ جانتے تھے کہ مصر پر حملہ کرنا اور اُسے فتح کر لینا کس قدر آسان کام ہے۔

* لیکچرار شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج، جہانیاں، پاکستان۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فتحِ مصراوراس کے عوامل

۱۸ھ میں جب حضرت عمرؓ جابیہ آئے تو عمرو بن العاصؓ نے ان سے اس کا تذکرہ کیا اور انھیں یقین دلایا کہ فتح مصر مسلمانوں کے لئے قوت و امداد کا سرچشمہ ہوگی کیونکہ یہ ملک جس قدر دولت مند ہے اسی قدر اپنی حفاظت کرنے سے عاجز ہے۔ حضرت عمرؓ اس پر راضی نہیں تھے کہ مسلمانوں کو کسی ناگہانی خطرے میں ڈالیں۔ لیکن آخر عمرو بن العاصؓ کے اصرار پر چار ہزار سپاہیوں کے درمیان ایک مختصر سی فوج ان کے سپرد کی اور غالبًا اس خیال سے کہ خلیفہ کہیں اپنا ارادہ نہ بدل دیں، عمرو بن العاصؓ اسی رات کو مصر کی جانب روانہ ہو گئے اور ابتدائی طور پر کچھ فتوحات حاصل کر لیں۔ اس عرصے میں حضرت عمرؓ نے بھی مصر کی فتح کا ارادہ کر لیا تھا اور حضرت زبیر بن العوامؓ کی سرکردگی میں پانچ ہزار تازہ دم فوج عمرو بن العاصؓ کی مدد کے لئے بھیج دی تھی۔ اب یہ متحدہ فوج آگے بڑھی اور رجب ۱۹ھ میں ''عین شمس'' کے سامنے رومی فوج کو شکست دی۔ شہر کی فتح کے بعد قلعہ بابلیون کی مزاحمت جاری رہی۔ مقوقس (کوروش) بذات خود یہاں موجود تھا۔ اس نے عمرو بن العاصؓ سے خط و کتابت شروع کی اور معاہدے کی شرائط طے کرنے کے بعد ان کی توثیق کے لئے قسطنطنیہ گیا۔ مگر قیصر ہرقل نے یہ عہد نامہ تسلیم کرنے سے انکار کیا اور مقوقس کو جلاوطن کر دیا۔ اس دوران میں ۲۲ صفر ۲۰ھ کو ہرقل کا انتقال ہو گیا اور جب اہل بابلیون ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے ربیع الثانی ۲۰ھ کو ہتھیار ڈال دیئے۔ اس فتح سے ''ڈیلٹا'' کے مشرقی حصے اور مصر صعید پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور عمرو بن العاصؓ دریائے نیل کو عبور کر کے اُس کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ ''نیکو'' پہنچے۔ ۲۶ جمادی الثانی ۲۰ھ کو اہل شہر نے اطاعت قبول کر لی۔ اب اسلامی فوج آہستہ آہستہ ''اسکندریہ'' کی طرف بڑھی، یہ شہر سیاسی، بحری اور تجارتی لحاظ سے اس قدر اہم تھا کہ اسے کھو دینا رومیوں کے لئے خودکشی کے مترادف تھا۔ اس لئے یہاں مسلمانوں کی مزاحمت ہوئی تاہم اسکندریہ بھی فتح ہو گیا۔

مصر کی سرحدوں کی حفاظت

مصر کے حدود اربعہ قدرتی طور پر متعین تھے۔ شمال میں بحیرۂ روم، مغرب میں صحرائے لیبیا اور مشرق میں ریگستان عرب اور بحیرۂ احمر صرف جنوبی سرحد غیر معین تھی اور واقعات کے لحاظ سے بدلتی رہتی تھی۔ فتح اسکندریہ کے بعد ضروری تھا کہ مغربی سرحد کو بحیثیت مجموعی محفوظ بنا لیا جائے۔ چنانچہ ۲۱ھ کے اواخر میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے برقہ کو اور ۲۲ھ (یا بروایتے ۲۳ھ) میں طرابلس الغرب کو فتح کر کے یہ کمی پوری کر دی۔ (۴) ذی الحجہ ۲۳ھ میں حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے عمرو بن العاصؓ کو معزول کر کے عبد اللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کو مصر کا حاکم مقرر کیا اور شہری اور مالی حکومت (صلاۃ و خراج) ان کے سپرد کر دی۔ عبد اللہ بن سعد ۲۳ھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ۳۵ھ تک حاکم مصر رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے دو کام سرانجام دیے۔ اول تو انھوں نے جرجیر (گریگوری) جو طرابلس الغرب سے ''طنجہ'' تک تمام شمالی افریقہ کے ساحل پر رومیوں کی طرف سے حاکم تھا، شکست دی۔(۵) گو یہ واقعہ شمالی افریقہ کی فتح کا آغاز تھا لیکن عبداللہ بن سعدؓ نے ملک پر قبضہ کرنے کا خیال نہیں کیا کیونکہ اس وقت مقصد مصر کی مغربی سرحد کی مزید حفاظت تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مصر کے جنوبی سرحد کو بھی متعین کر دیا۔ ''نوبہ'' کی سرحد پر مسلسل جنگ جاری رہتی تھی اور عمرو بن العاصؓ نے بھی اس طرف توجہ کی تھی۔ لیکن بالآخر ۳۱ھ میں عبداللہ بن سعد نے حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ''نوبہ'' پر حملہ کیا۔ ''دُمقلہ'' کے مقام پر سخت معرکہ پیش آیا جس میں مسلمانوں نے بہت کچھ نقصان اُٹھا کر آخر فتح پائی۔ اس جنگ کے بعد جسے الکندی نے ''غزوۃ الاساود'' لکھا ہے۔(٦) مسلمانوں اور اہل نوبہ میں ایک معاہدہ طے پایا۔ مقریزی نے اس کی پوری عبارت نقل کی ہے۔ اس کے مطابق نوبہ پر مسلمانوں کی سیادت قائم ہوگئی، مصر کی جنوبی سرحد مشخص کر دی گئی اور اس کے بدلے مسلمانوں نے وعدہ کیا کہ مصر سے غلہ نوبہ بھیجا جایا کرے گا۔(۷) اس طرح بحیثیت مجموعی ۳۱ھ میں مصر کی فتح مکمل ہوئی۔ تاریخ مصر میں اس سے بڑا انقلاب اس سے قبل واقع نہیں ہوا تھا۔ اس تیرہ برس کے عرصے میں صرف یہی نہیں ہوا کہ مصر کے حکمران بدل گئے اور باشندوں کو نئے حالات سے دوچار ہونا پڑا بلکہ یہ واقعہ مصر کی حقیقی آزادی کا پیش خیمہ تھا۔ تمام فاتحین اب تک مصر کو اپنے مفاد کی تکمیل کا ایک ذریعہ سمجھتے آئے تھے۔ لیکن اب اسلامی فتح سے ایک سیاسی انقلاب کی تکمیل ہی نہیں ہوئی بلکہ انتظامی نظم ونسق کے حوالے سے ایک ہمہ گیر ذہنی اور مادی انقلاب شروع ہوا۔ ایک ایسی قوم وہاں حکمران بنی جو آزادی کا حقیقی مفہوم سمجھتی تھی اور اسے عزیز رکھتی تھی۔ ان کا سیاسی اور معاشرتی نظام ونسق اس جذبے کو نقصان پہنچانے کی بجائے اُسے اور زیادہ پختہ اور مستحکم بنانے میں معاون ثابت ہوئے۔

فتح مصر کا عربوں کے معاشی حالات پر اثر:

۱۹ھ میں مصر کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کو وہاں کا حاکم ''علی الصلاۃ و علی الخراج'' مقرر کیا گیا اور وہ چار سال چند مہینے وہاں رہے۔(۸) اس دوران میں اگر انھوں نے مصر میں کوئی نئے سیاسی یا انتظامی ادارے قائم کئے تھے تو ان کا علم ہم تک نہیں پہنچا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پرانا نظم ونسق بدستور جاری رہا تھا اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آپؓ کے عہد حکومت میں عربوں نے صرف اس سے غرض رکھی کہ جو محاصل رائج تھے وہ باقاعدہ طور پر وصول ہوتے رہیں۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ فتح مصر سے عربوں کو کیا معاشی فائدے پہنچے؟ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ ۱۸ھ میں حجاز کے قحط کو مصر کے غلے کی مدد سے دور کیا گیا تھا۔ اس ابتدائی دور میں عربوں کو اسی قسم کی مدد کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اسی کے بعد کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاصؓ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مصریوں کی ایک جماعت کو مدینہ بلایا اوران سے کہا کہ وہ سب اس پرغور کریں کہ ایک نہر دریائے نیل سے ساحل بحر احمر تک کھودی جائے تا کہ حجاز تک غلہ پہنچنے میں آسانی ہو۔ کیونکہ غلہ کو دور سے اونٹوں پر لاد کر لانے میں اتنا وقت گذر جاتا تھا کہ اہل حجاز اُس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اہل مصر نے آپس میں مشورہ کیا، وہ اس تجویز کے مخالف تھے کیونکہ اس سے ان کے ملک کے معاشی حالات پر برا اثر پڑتا تھا۔لیکن کچھ رد وقدح کے بعد وہ اس پر راضی ہو گئے اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے ایک سال میں یہ نہر (خلیج) جو''خلیج امیر المومنین'' کہلاتی تھی تیار کرا لی اوراس میں بار برداری کی کشتیاں چلنے لگیں۔ چنانچہ اب مکہ اور مدینہ کواسی ذریعے سے غلہ بھیجا جانے لگا۔خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے تک یہ خلیج برابر کام میں آتی رہی مگر بعد کے والیوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور وہ ریت سے پٹ گئی۔ مصر کے حاجی بھی ساحل تنیس سے اسی خلیج کے ذریعے سفر کر کے قلزم پہنچتے تھے اور وہاں سے بحری جہازوں میں منتقل ہوا کرتے تھے۔(۹)

عرب قبائل کی آبادکاری کا مسئلہ:

حضرت عمرو بن العاصؓ کے سامنے پہلا اورفوری مسئلہ یہ تھا کہ فاتح فوج کہاں ٹھہرائی جائے۔ابن عبدالحکم نے بیان کیا ہے کہ جب عمرو بن العاصؓ اسکندریہ میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر کہ وہاں کے جو مکانات خالی پڑے ہیں وہ مسلمانوں کے لئے کافی ہوں گے انھوں نے وہیں قیام کرنا چاہا اور حضرت عمرؓ سے اس کے متعلق استصواب کیا گیا لیکن وہ اس کے خلاف تھے کہ عمرو بن العاصؓ کے اور مسلمانوں کے درمیان دریا حائل ہو اور یہ معلوم کر کے اسکندریہ تک پہنچنے کے لئے نیل عبور کرنا پڑتا ہے انھوں نے عمرو بن العاصؓ کو اسکندریہ میں قیام کی اجازت نہیں دی اور وہ فسطاط واپس آ گئے۔(۱۰) یہاں آکر نئے مسائل پیدا ہوئے۔مختلف عرب قبائل جو اس فاتح فوج میں شریک تھے، ان میں جائے قیام کے متعلق جھگڑے ہونے لگے کیونکہ یہ قبائل اس عرصہ میں ایک دوسرے سے مل جل گئے تھے۔اس پر عمرو بن العاصؓ نے معاویہ بن حدیج التجیبی،شریک بن سمی الغطیفی،عمرو بن قحزم الخولانی،حیویل بن ناشر المغافری کواس کام پر مقرر کیا کہ وہ مختلف قبائل کی قیام گاہ کا تعین کریں۔ ۲۱ھ میں ان حضرات نے لوگوں کو مختلف مقامات میں اتارا اور مختلف قبائل کو الگ الگ کیا (۱۱) اوراس طرح عربوں کی آبادکاری کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ اگر ہم عربوں کے دوسرے بسائے ہوئے شہروں کا مقابلہ''فسطاط'' سے کریں تو ایک بین فرق نظر آئے گا۔عراق میں کوفہ اور بصرہ دوشہر بالکل اسی غرض سے بسائے گئے تھے، جوفسطاط کے بسانے کی غرض تھی۔ان دونوں شہروں میں عرب قبائل ملے جلے رہتے تھے اور یمنی اور مضری یا قیسی قبائل کے لئے شہر کے الگ الگ حصے مختص نہ تھے اور نہ اس کا پتہ چلتا ہے کہ ان شہروں میں زیادہ تعداد قیسی قبائل کی تھی یا یمنی قبائل کی۔ برخلاف اس کے فسطاط کو اس طرح تقسیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا گیا تھا کہ ہر قبیلہ الگ الگ رہتا تھا۔

فوج کے مختلف قبائل جائے قیام کا تعین کرنے کے علاوہ عمرو بن العاصؓ نے موسم بہار میں ہر قبیلے کے لئے اس کی قیام گاہیں اور چراگاہیں (التربیع و اللبن) بھی مقرر کر دیں مگر اسے خود قبائل کی پسند پر چھوڑ دیا۔ ابن الحکم لکھتا ہے کہ گو یہ انتظامات ایک حد تک مستقل تھے لیکن بعض قبائل کبھی کبھی ایک جگہ سے دوسری جگہ تجاوز بھی کر جاتے تھے۔ بڑے بڑے قبائل انھیں مقامات میں موسم بہار گزارتے تھے۔ (۱۲) اتنی بات یقینی ہے کہ یہ قاعدہ محض وقتی نہیں تھا بلکہ سال بسال یہی طرز عمل اختیار کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سالانہ قیام کے دوران میں کچھ قبائل ایسے بھی تھے جنھوں نے مختلف اطراف میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ مدلج نے حمیر کے بعض افراد کے ساتھ خربتا میں اور خشین نے لخم اور جذام کے ساتھ مل کر صان، ابلیل اور طرابیہ میں مستقل نو آبادی بنالی تھی۔ (۱۳)

مصر میں عربیت کا ارتقاء

عربوں کا فسطاط، جیزہ اور اسکندریہ میں بس جانا اور خصوصاً موسم بہار میں اس طرح مختلف مقامات میں منتشر ہو جانا درحقیقت مصر میں عربیت کے ارتقاء کی پہلی منزل تھی کیونکہ ان کے قیام کے ساتھ ساتھ عربی زبان، عربی معاشرت اور عربی اثرات بھی ان مقامات پر پھیلے۔ یہ ایک چیز تھی جہاں عربوں نے قدیم رومی اصول کی پابندی نہیں کی اور شروع ہی سے ملک میں پھیلنا شروع کر دیا۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس تدوین سے حکومت کو کیا فائدہ پہنچا؟ واقعہ یہ ہے کہ عرب جہاں کہیں بھی وہ آباد ہو، ایک پیشہ ور سپاہی سمجھا جاتا تھا اور بوقت ضرورت اسے فوج میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ قانوناً سپاہی ہونے کے لحاظ سے وہ اس کا مجاز نہ تھا کہ زراعت یا کسی اور پیشے کو بسر اوقات کا ذریعہ بنائے۔ (۱۴) گزارے کے لئے اُسے حکومت سے حسب مراتب وظیفہ (فریضہ) ملتا تھا اور کوئی عرب ایسا نہ تھا جو وظیفہ خوار نہ ہو۔ چنانچہ امیر معاویہ کے زمانے میں بیان ہوا ہے کہ مصر کے دیوان کی تعداد چالیس ہزار تھی اور ان میں چار ہزار ایسے تھے جنھیں دو دو سو دینار وظیفہ ملتا تھا۔ (۱۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں مصر میں عرب فوج کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ یہ عرب جو کسی زمانے میں سپاہی تھے رفتہ رفتہ اراضی کے مالک ہوتے گئے اور زراعت نہ کرنے کی پابندی اٹھ گئی۔ مگر ان کے فریضے بدستور جاری رہے گو ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز نے اس ''عطا'' میں اضافہ کیا (۱۶) اور ان کے جانشین یزید بن عبدالملک نے اپنے حاکم مصر، بشر بن صفوان کو حکم دیا کہ یہ اضافہ منسوخ کر دے۔ (۱۷)

اہل مصر سے عربوں کے معاہدات

یہ شہری تنظیم اور عرب قبائل کی نو آبادکاری کے مسائل کا فیصلہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے فرائض کا صرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک حصہ تھا۔ وہ مالیات کے حاکم (علی الخراج) بھی تھے اور اس نومفتوحہ ملک کے ذرائع آمدنی اور محاصل کا تصفیہ کرنا بھی انھیں کا فرض تھا۔ فتح کے دوران میں اور اس کے فوراً بعد فاتح فوج کو رسد کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس ابتدائی زمانے کے متعلق ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ مصر کے تین رؤسا سے الگ الگ تین عہد نامے طے ہوئے تھے اور ان کے مطابق صلح کی شرط یہ تھی کہ فی کس دو دینار بطور''جزیہ'' ادا کئے جائیں گے۔ حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق جزیہ صرف بالغ مردوں پر لگایا گیا تھا۔(۱۸) اور اس کے علاوہ ''ارزق المسلمین'' کا انتظام کیا جائے۔ پانچ شرطیں اور تھیں کہ انھیں جلا وطن نہیں کیا جائے گا، ان کی عورتوں کو ان سے الگ نہیں کیا جائے گا، کاشتکاروں سے تعرض نہیں ہوگا، وہ اراضی سے بے دخل نہیں کئے جائیں گے اور محاصل میں اضافہ نہیں ہوگا۔(۱۹)

''ارزق المسلمین'' کی تفصیل یہ بیان ہوئی ہے کہ ہر ماہ فی کس ایک اِردَب غلہ دیا جائے گا۔ چربی اور شہد کی مقدار راوی نے بیان نہیں کی۔ اس کے علاوہ کپڑے اور لباس مہیا کرنے پڑتے تھے جو خلیفہ کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ رعایا پر یہ بھی فرض تھا کہ جو مسلمان ان کے ہاں مقیم ہوں تین دن تک اُن کی ضیافت کا انتظام کریں۔(۲۰) ابتدائی عہد کے جو قرطاس دریافت ہوئے ہیں ان سے اس روایت کی توثیق ہوتی ہے اور بعض اور تفصیلات بھی معلوم ہوتی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے زیادہ اہم چیز فوج کی رسد تھی، خصوصاً اس وقت جب کہ فوج کوچ کر رہی ہو۔ تین دن کے''ارزق المسلمین''ایک قفیز گیہوں فی کس فی ماہ، نصف پیمانہ تیل، موٹا پیسا ہوا آٹا، بھیڑیں اور پکا ہوا کھانا تھا۔ گھوڑوں کے چارے کی مقدار نقد ادا کرنی پڑتی تھی۔ انھیں قرطاسوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو سپاہی گھروں میں مقیم ہوتے تھے ان کے لئے گھر والوں کو کیا انتظامات کرنے پڑتے تھے۔(۲۱)

مصر کا نظام محاصل

حضرت عمرو بن العاصؓ پہلے شخص تھے جنھوں نے مصر سے محصول وصول کیا۔ یہ رقم بحساب دو دینار فی کس، ایک کروڑ بیس لاکھ دینار تھی۔(۲۲) لیکن کیا یہ محصول وہی چیز ہے جسے جزیہ کہتے ہیں؟ غالباً بیکر پہلا شخص ہے جس نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ابتدائی زمانے میں جزیہ اور خراج مترادف الفاظ تھے اور دوسری صدی ہجری میں پہلی مرتبہ ان میں فرق پیدا ہوگیا۔(۲۳) اگر غور کیا جائے تو ''لگان اراضی'' فی کس محصول یا کسی اور محصول کا نام نہیں تھا بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ مختلف محاصل کو یک جا جمع کر کے یک مشت رقم کسی نہ کسی طرح وصول ہو جائے۔ اس رقم میں علاوہ لگان کے تجارتی محصول اور رومی فی کس محصول بھی شریک تھا اور اسے صرف اس لحاظ سے فی کس محصول کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر شخص سے بحصۂ رسدی وصول ہوتا تھا۔ بعینہٖ یہی عمل پہلی صدی ہجری میں جاری رہا اور جزیہ اور خراج میں فرق نہیں کیا گیا۔ کیونکہ عرب اتنے بے وقوف نہ تھے کہ اس بنے بنائے اصول کو توڑ کر نئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخصوں میں پھنستے اور محاصل کے نظام میں ابتری پیدا کر دیتے۔ اس کی چند مثالیں نقل کر دینا کافی ہوگا۔ بلا ذری نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیہ کی ادائی پر اہل اذرح سے صلح کی تھی۔ (۲۴) یہاں مردم شماری اور فی کس محصول کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ عام معنوں میں جزیہ نہیں بلکہ خراج (باج) تھا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیۃ الکلبی کو خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا کہ تین چیزوں میں ایک اختیار کر لے۔ ان میں سے ایک خراج بھی تھا۔(۲۵) آپؐ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ نے اسلامی فوجیں باہر بھیجی تو سپہ سالاروں کو ہدایت کی کہ دشمن کے سامنے تین شرطیں پیش کریں کہ ان میں سے ایک قبول کر لیں۔ اسلام یا جزیہ اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو جنگ۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے عراق میں اہل حیرہ سے اور شام و فلسطین میں اہل دمشق اور اہل حمص سے یک مشت رقمیں وصول کی ہیں اور انھیں جزیہ ہی کہا گیا ہے۔ ان موقعوں پر بھی مردم شماری اور فی کس محصول کا ذکر نہیں اور نہ اس کا موقع تھا۔ صریحاً یہاں جزیہ سے مراد پھر خراج (باج) ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر رکھتے ہوئے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ابتدائی عہد میں جو فی کس محصول لگایا گیا تھا وہ ہر جگہ رومی نظام محاصل کے مطابق تھا اور یہ محصول حقیقت میں خراج ہے نہ کہ جزیہ۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد اہل مصر پر سے محاصل کا بوجھ کم ہو گیا تھا کیونکہ رومی نظام محاصل گنجلک بھی تھا اور مطلق العنانہ بھی۔(۲۶) محاصل کی مقدار اور ان کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ خاص خاص اشخاص یا جماعتیں ادائی محاصل سے مستثنیٰ تھیں۔ چنانچہ اہل اسکندریہ فی کس محصول کی ادائی سے بری تھے۔(۲۷) یہی حال مذہبی پیشواؤں کا تھا۔ مگر اب عربوں کے زمانے میں مستثنیات کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور اہل اسکندریہ بھی بغاوت کر کے اپنے حقوق کھو چکے تھے۔ عربوں نے محض ایک (یا دو) محصولوں پر اکتفا کر کے ایک اصلاحی صورت پیدا کی۔ محاصل کی تعداد گھٹا دینے کی وجہ سے انتظامی مصارف میں کمی ہوئی اور محصول ادا کرنے والے بھی بار زیادہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ فتح مصر کے وقت جو عہد نامہ ہوا تھا اس میں مفتوحین کی مذہبی آزادی برقرار رکھی گئی تھی۔ اس لیے کلیسا کا انتظام خود اہل مصر کے تصرف میں تھا اور اُس کے اخراجات کے لئے وہی لوگ رقم مہیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی طرف سے کلیسا پر کوئی محصول نہیں لگایا گیا۔ پیشوایان مذہب محصول سے بری تھے اور ان کی طرف سے بھی اہل ذمہ محصول ادا کرتے تھے۔(۲۸) زراعت پر تمام محصولوں کا بوجھ ڈالنا اور تاجروں کو اس سے مستثنیٰ رکھنا قرین انصاف نہ تھا۔ اس لیے قیاس یہ ہے کہ تجارت پر بھی محصول لگایا گیا ہو۔ خود رومیوں میں بھی اس کا دستور تھا۔

مصر کے اندرونی نظم و نسق میں عربوں کی عدم شمولیت

حضرت عمرو بن العاصؓ کے زمانے میں عربوں نے مصر کے اندرونی نظم و نسق میں بالکل دخل نہیں دیا تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اورصرف اس سے غرض رکھی تھی کہ محصول کی رقم وصول ہوتی رہے۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے قبطیوں سے مشفقانہ سلوک روا رکھا تھا اوراس کی ضرورت بھی تھی۔ظاہر ہے کہ مصر میں عربوں کی تعداد مٹھی بھرتھی اور وہ نظم ونسق کے کام سے قطعاً نا واقف تھے۔اس لیے لازمی تھا کہ پرانے ملازمین اور منتظمین کو برقرار رکھا جائے۔(۲۹) ابھی چالیس برس کا زمانہ گزرنا اور باقی تھا کہ مسلمان اندرونی نظم ونسق میں حصہ لیں اورقبطیوں کو برطرف کرنے کا خیال دل میں لائیں۔بہرحال عمرو بن العاصؓ کی حکومت سے مصری مطمئن تھے۔عمرو بن العاصؓ دومرتبہ والئی مصر مقرر ہوئے۔پہلی مرتبہ حضرت عمرؓ کے عہد میں۔۲۴ھ میں حضرت عثمانؓ نے انھیں معزول کیا۔دوسری مرتبہ امیر معاویہؓ نے انھیں ۳۸ھ میں والی مقرر کیا اور۴۳ھ میں اپنی وفات تک آپ وہیں رہے اور وہیں دفن ہوئے۔(۳۰) پہلی ولایت کے دوران میں وہ ملک کانظم ونسق مکمل کر چکے تھے۔

سلیم بن عمیر التجیبی ۳۹ھ میں مصر کے پہلے قاضی مقرر ہوئے اور ۷۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔(۳۱) ۸۴ھ میں غیاض بن غنم التجیبی اسکندریہ کے والی مقرر ہوئے تھے۔(۳۲) ۷۵ھ میں عبدالعزیز بن مروان اپنے بھائی خلیفہ عبدالملک سے ملنے کے لئے دمشق گیا تو اس نے زیاد بن حنظلہ التجیبی کو اپنا قائم مقام بنایا تھا۔(۳۳) ۳۵ھ میں عبداللہ بن سعدؓ جب حضرت عثمانؓ سے ملنے مدینہ گئے تو انھوں نے سلیم بن عمیر التجیبی کو مالیات کا حاکم (علی الخراج) مقرر کیا تھا۔(۳۴) یہ پہلا موقع تھا کہ ''علی الصلاۃ'' اور''علی الخراج'' کے منصب پر دو الگ الگ عہدہ دار مقرر ہوئے تھے۔حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا قاتل بھی مصر کا رہنے والا عبدالرحمٰن بن بحسنس تجیبی تھا۔(۳۵) تجیب کے بعد دوسرا مقتدر قبیلہ خولان تھا۔۶۲ھ میں یزید بن معاویہ نے سعید بن یزید کو حاکم مقرر کیا مگر اہل مصر کو یہ پسند نہ آیا۔مصریوں کا ایک وفد جس میں عمرو الخولانی بھی شریک تھا اس سے ملا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔(۳۶) ۸۸ھ میں عبداللہ بن عبدالملک بن مروان (حاکم مصر) اپنے بھائی خلیفہ ولید سے ملنے دمشق گیا تو اس نے عبدالرحمٰن بن عمرو بن مخزوم الخولانی کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔(۳۷)

شیعان عثمانؓ وشیعان علیؓ کے باہمی تنازعات

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جو فتنہ برپا ہوا اس میں مصر کے عرب پیش پیش تھے۔خلیفہ کے خلاف سازش یہیں شروع کی گئی اور یہیں اس کی تکمیل ہوئی۔حتیٰ کہ آپ کے مقرر کردہ حاکم عبداللہ بن سعدؓ کو مجبوراً مصر چھوڑنا پڑا۔ مصر ہی سے مفسدوں کی ایک جماعت خلیفہ کے خلاف مدینہ روانہ ہوئی اور یہیں کے ایک شخص کنانہ بن بشر نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا۔ بظاہر اس کا مطلب یہ ہونا چاہئے تھا کہ مصر میں حضرت عثمانؓ کے مخالفوں اور حضرت علیؓ کے ہمدردوں کی تعداد زیادہ تھی۔لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ہی مصر میں ایک ردعمل شروع ہوا۔ابتداً شیعان عثمان کی تعداد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرور کم تھی۔ مگر ۳۶ھ میں آپ کے قصاص کا مطالبہ کرنے کے لئے ایک بیعت لی گئی اور معاویہ بن حدیج کو شیعان عثمان نے اپنا امیر مقرر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد بن ابی حذیفہ جس نے حضرت عثمانؓ کی مخالفت میں نمایاں حصہ لیا تھا اور مصر پر قابض ہو گیا تھا قتل ہوا۔ اب حضرت علیؓ نے قیس بن سعد الانصاریؓ کو مصر کا حاکم مقرر کیا اور ۳۷ھ میں وہ وہاں پہنچے۔ انھوں نے تالیف قلوب کی حکمت عملی اختیار کی اور فرقہ وارانہ سیاسیات سے احتراز کیا۔ جب تک وہ مصر میں رہے امن وامان رہا لیکن اسی سال انھیں معزول کیا گیا اور محمد بن ابی بکر والی بن کر مصر پہنچے۔ انھوں نے اپنے طرز عمل سے مصر کے حالات کو خراب کر دیا اور اسی وجہ سے شیعان عثمان کو فروغ پانے اور ترقی کرنے کا موقع مل گیا۔

۳۸ھ میں یہاں شیعان عثمان اتنے کامیاب ہو گئے تھے کہ عمرو بن العاصؓ نے امیر معاویہؓ کی طرف سے مصر پر قبضہ کر لیا اور ۴۳ھ میں اپنی وفات تک وہاں رہے۔ اب بنو علی کا رسوخ اور اثر مصر سے ایسا زائل ہوا کہ ڈیڑھ سو برس تک اس خاندان کے کسی رکن کو وہاں آنے اور قدم جمانے کی ہمت نہ ہوئی۔ شیعان بنو امیہ کے قدم اب وہاں اس قدر مضبوطی سے جم گئے تھے کہ انھیں اکھاڑنا ناممکن تھا۔ ۶۴ھ میں عبد اللہ بن زبیرؓ نے عبد اللہ بن عتبہ بن جحدم کو اپنی طرف سے مصر کا والی مقرر کیا مگر وہ ایک سال بھی وہاں نہ رہ سکے۔ ۶۵ھ میں شیعان بنو امیہ نے مروان بن الحکم کو جسے اس سے قبل شام میں خلیفہ منتخب کر لیا گیا تھا مصر آنے کی دعوت دی اور جمادی الاول ۶۵ھ میں مروان فسطاط میں داخل ہوا۔ اس کا نوجوان اور ناتجربہ کار بیٹا عبد العزیز اس کے ساتھ تھا۔ اسی کو اُس نے ملک کے شہری اور مالی امور کا حاکم مقرر کیا۔(۳۸) بیس برس تک عبد العزیز نے یہ خدمت انجام دی۔ مروان جب مصر سے واپس ہونے لگا تو عبد العزیز نے کہا کہ ''اے امیر المومنین! ایسے ملک میں میرا گزارا کیسے ہوگا جہاں میرا کوئی رشتہ دار نہیں؟'' مروان نے جواب دیا:

> یابُنَیَّ! عُمَّھم باحسانك یکونوا کلھم بنی ابیك واجعل وجھك طلقاً تصف لك مودتھم واقع الی کل رئیس منھم انه خاصتك دون غیرہ۔ یکن عیناً لك علی غیرہ و ینقاد قومه الیك۔(۳۹)

> ''اے بیٹے! احسان کے ذریعے سے انھیں ایسا کر لے کہ وہ تمہارے چچا ہو جائیں، وہ سب تیرے رشتہ دار بن جائیں گے۔ ہر وقت کشادہ پیشانی سے رہنا، تجھ سے ان کی محبت صاف ہو جائے گی۔ ہر رئیس کو یہ باور کرا دے کہ دوسروں سے قطع نظر وہی تیرا خاص آدمی ہے۔ وہ دوسروں کے خلاف تیرا مددگار ہو جائے گا اور اپنی قوم کو تیرا مطیع ومنقاد بنا دے گا۔''

اس کے علاوہ مروان نے عبد العزیز کو اور بہت سی نصیحتیں کیں جن میں اس پر خاص طور سے زور دیا کہ بغیر مشورے کے کام نہ کرنا کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورے کی ضرورت پڑتی تھی تو ہم جیسوں کو اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔(۴۰) تاریخ گواہ ہے کہ باپ کی نصیحتوں پر بیٹے نے کس طرح عمل کیا اور بیس برس تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کس کامیابی سے مصر پر حکومت کی۔

مصر کے نظام اراضی کے خدوخال

۶۷ھ میں فسطاط میں طاعون پھیلا اور عبدالعزیز وہاں سے حلوان چلا آیا، جو فسطاط سے دو فرسخ کے فاصلے پر دریائے نیل کے کنارے واقع تھا۔(۴۱) اور آخری وقت تک وہیں رہا۔ یہاں اُس نے اپنے لیے نہایت عمدہ محل اور مکانات تعمیر کرائے اور اس کی بدولت کھجور کے درخت اور انگور مصر پہنچے اور حلوان میں لگائے گئے۔اس نخلستان کو پانی دینے کے لئے عبدالعزیز نے ایک نہر کھدوائی تھی۔(۴۲) حلوان میں اس نے ایک اور رفاہ عامہ کا کام کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے زراعت سے خاص دلچسپی تھی۔ یہاں اُس نے دریائے نیل کا پانی ناپنے کے لئے ایک مقیاس تعمیر کرایا مگر اس کا ذرعہ چھوٹا تھا۔(۴۳) جیزہ میں بھی اُس نے کھجور کے درخت لگوائے تھے۔ یہ باغ بعد میں ''جنان کعب'' کے نام سے مشہور ہوا۔(۴۴) ایک روایت کے مطابق عبدالعزیز ہی کے مشورے سے ۷۶ھ میں خلیفہ عبدالملک نے عہد اسلام سے پہلی مرتبہ دینار اور درہم مسکوک کرائے تھے۔(۴۵) اس کے علاوہ اُس نے عمرو بن العاصؓ کی تعمیر کردہ جامع فسطاط میں اضافہ کرایا تھا۔(۴۶)

عمرو بن العاصؓ کے زمانے سے اب تک مصر کے حالات اس قدر تبدیل ہو چکے تھے کہ عبدالعزیز نے وہاں نئے سرے سے تدوین کی۔ یہ مصر کی دوسری تدوین تھی۔اس کی تفصیل سے تو ہم ناواقف ہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ اس کی ضرورت کیوں ہوئی تھی۔ہم دیکھ آئے ہیں کہ عمرو بن العاصؓ نے فسطاط میں مختلف قبائل آباد کئے تھے لیکن اس عرصہ میں اکثر و بیشتر علاقے پرانے باشندوں کے ہاتھ سے نکل کر نئے باشندوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ان تمام تبدیلیوں کا ایک حد تک تفصیلی تذکرہ ابن عبدالحکم میں محفوظ رہ گیا۔(۴۷) سکونتی اراضی میں تو تبدیلیاں ہو ہی رہی تھیں زرعی اراضی بھی تغیر وتبدل سے محفوظ نہیں تھی۔ چنانچہ اب پہلی مرتبہ مصر کی معاشی اور ارضی تاریخ میں قطائع کا اثر نمایاں ہونا شروع ہوا۔ یہاں قطائع سے مراد اس قسم کی جاگیریں نہیں جن کا رواج تیسری صدی ہجری میں ہوا بلکہ ان سے مراد زرعی جائیدادیں ہیں جن کی خرید وفروخت ہوسکتی تھی۔ قطائع کا رواج کب سے ہوا اس کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس طرح زمینیں تقسیم کرنے کی ابتداء ہوئی تھی اور بعض کا خیال ہے کہ ان دو حضرات یا حضرت علیؓ نے کبھی قطائع تقسیم نہیں کئے(۴۸) بلکہ یہ تبدیلی حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی۔(۴۹) لیکن تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک صحابی سندر (یا ابن سَندر) کو مصر میں ایک ہزار فدان (ایکڑ) زمین بطور قطیعہ دی تھی اور اس کے علاوہ مصر میں اور کوئی قطیعہ کسی کو نہیں دیا گیا۔ یہ قطیعہ سَندر کے مرنے کے بعد عبدالعزیز کے بیٹے الاصبغ نے اُن کے وارثوں سے خرید لیا تھا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی کے نام پر یہ زمین ''منیۃ الاصبغ'' کہلانے لگی تھی۔(۵۰) یہ امر کہ اس قطیعے کی خرید وفروخت ہوئی ثابت کرتا ہے کہ اسے عام معنوں میں جاگیر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اب عرب زرعی زمینوں پر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ یہ پرانے اصول اور قانون کے خلاف تھا۔(۵۱) حقوق مالکانہ کی انہیں تمام تبدیلیوں اور عرب قبائل کے اس طرح نقل مکانی کی وجہ سے اس دوسری تدوین کی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔

اس طرز عمل سے ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ جو زمینیں عربوں کے قبضے میں آ گئیں ان پر لازمی طور سے لگان نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ لیکن جو خراج حسب معاہدہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے زمانے میں عاید کیا گیا تھا اُس میں کوئی کمی یا زیادتی ممکن نہ تھی۔ لہٰذا ذمیوں پر محاصل کا بوجھ بڑھتا گیا اور سرکاری میزانیہ کو متوازن کرنے کی غرض سے محصول میں اضافہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اپنے زمانے میں امیر معاویہؓ نے حکم دیا تھا کہ ہر قبطی کے خراج میں ایک قیراط کا اضافہ کیا جائے۔ لیکن مصر کے صاحب الخراج نے پرانے عہد نامے کی بناء پر ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی پاداش میں معزول ہوا تھا۔(۵۲) اس کے بعد عراق میں حجاج نے ان ذمیوں سے جو مسلمان ہو گئے تھے جزیہ (خراج) وصول کرنا شروع کیا اور خلیفہ عبدالملک نے عبدالعزیز کو لکھا کہ مصر میں بھی یہی طرز عمل اختیار کرے۔ لیکن عبدالرحمٰن بن حجیرہ الخولانی سے مشورہ کر کے عبدالعزیز نے خلیفہ کی اس تجویز کو منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔(۵۳) عبدالرحمٰن بن حجیرہ کا مشورہ دو وجہ سے اہم تھا، وہ عبدالعزیز کی طرف سے مصر کے قاضی بھی تھے اور بیت المال کے نگران بھی۔(۵۴) انھوں نے اس کی مخالفت اس بنا پر کی تھی کہ ذمی پہلے ہی اپنے راہبوں کا جزیہ (خراج) ادا کر رہے ہیں اور ان پر مزید سختی روا رکھنا مناسب نہیں۔(۵۵) بہر حال عبدالعزیز نے یہ مسئلہ ایک حد تک اس طرح حل کیا کہ اس کے حکم سے راہبوں کو شمار کیا گیا اور ہر راہب پر فی کس ایک دینار جزیہ عائد کیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مصر میں راہبوں سے جزیہ وصول کیا گیا۔(۵۶) اس سے قبل وہ اس سے مستثنیٰ تھے۔ اپنے بھائی کی وفات سے چند ماہ قبل، بیس برس دس مہینے تیرہ دن مصر پر حکومت کرنے کے بعد ۸۶ھ میں عبدالعزیز نے مصر ہی میں انتقال کیا۔ عہد اسلام میں مصر پر اس سے زیادہ طویل حکومت کسی حاکم نے نہیں کی۔(۵۷)

انتظامی نظم ونسق میں عربوں کی براہ راست شرکت

اب عبدالملک نے اپنے ستائیس سالہ نوجوان بیٹے عبداللہ کو ۸۶ھ میں مصر بھیجا۔ اسے حکم دیا گیا تھا کہ عبدالعزیز کی نشانیاں مٹا دے۔ اسی بناء پر اُس نے پرانے عمال میں تغیر وتبدل کیا۔ مگر اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ۸۷ھ میں دواوین کو یونانی زبان سے عربی میں منتقل کیا۔(۵۸) یہ درحقیقت مصر کی تاریخ کا بہت بڑا انقلاب تھا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب عرب براہ راست نظم ونسق میں حصہ لینا شروع کر رہے ہیں اور قبطیوں کو اس وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک جواجارہ حاصل تھا وہ اب ختم ہورہا ہے۔ چند ہی سال بعد اس انقلاب کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے۔لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ عربی زبان فی الفور عام طور پر دواوین میں استعمال ہونے لگے اور یونانی یا قبطی بالکل بے دخل ہو جائے۔ بلکہ اس تبدیلی کی تکمیل اس وقت ہوئی جب قبطیوں نے خود روز مرہ زندگی میں عربی زبان بولنی شروع کی۔ چنانچہ ۱۲۶ھ کا ایک قرطاس ملا ہے جس میں نظم ونسق کے کاروبار کے لئے یونانی زبان استعمال کی گئی ہے۔(۵۹) دوسری صدی ہجری کے آخر میں یونانی زبان الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی تھی اور تیسری صدی میں ''بطریک'' کو مجبوراً اپنے تمام احکام عربی زبان میں نافذ کرنے پڑے تا کہ عیسائی عوام انھیں سمجھ سکیں۔ بہر کیف بحیثیت مجموعی عبداللہ کامیاب نہیں رہا۔ اول تو ۸۷ھ میں مصر میں ایسا قحط پڑا جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی اور اس قحط کو لوگوں نے عبداللہ کی نحوست سے منسوب کیا۔ دوسرے اُس کا مقصد صرف اپنا بھلا کرنا اور دولت جمع کرنا تھا۔ اسی وجہ سے اہل مصر اُسے ''مُکَیَّس'' کہتے تھے۔(۶۰) اہل مصر نے اُس پر یہ بھی الزام لگایا تھا کہ وہ رشوتیں لیتا ہے اور بیت المال سے رقوم غبن کرتا ہے۔ آخر ان شکایات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۹۰ھ میں خلیفہ ولید نے اُسے معزول کر کے قُرَّۃ بن شریک کو صلاۃ وخراج پر مقرر کیا۔

مصر کی تدوین نو اور احیاء الموات

۹۵ھ میں قرۃ بن شریک نے مصر کی تیسری مرتبہ تدوین کرائی۔ گوتفصیلات مفقود ہیں لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ عبدالعزیز بن مروان کی دوسری اور قرۃ بن شریک کی تیسری تدوین کی درمیانی مدت میں عرب قبائل نے اول تو مصر ہی میں کثرت سے نقل مکانی کی تھی اور غالبًا باہر سے بھی عربوں کی اتنی بڑی تعداد مصر میں داخل ہو کر وہاں متوطن ہوئی تھی کہ اس نئی تدوین کی ضرورت پڑی۔ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ عبدالملک نے جب یہ تجویز دی تھی کہ ان ذمیوں سے جو مسلمان ہو گئے تھے، جزیہ وصول کیا جائے تو عبدالعزیز نے اُس کی مخالفت کی تھی۔ گو ہمیں علم نہیں کہ یہ تبدیلی کس سنہ میں ہوئی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ بن شریک نے عبدالملک کی پرانی خواہش پوری کر دی تھی اور ایسے ذمیوں پر جزیہ عائد کر دیا تھا۔ کیونکہ ۱۰۰ھ میں عمر بن عبدالعزیز نے اپنے صاحب الخراج حیان بن شریح کو حکم دیا تھا کہ ان ذمیوں پر سے جو مسلمان ہو گئے ہوں جزیہ اٹھا لے۔(۶۱) مگر آپ کا حکم بے اثر رہا۔قرۃ بن شریک کے زمانے کی ایک اور اہم تبدیلی کا پتہ ایک پرانے قرطاس سے چلتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی عہد میں پہلی مرتبہ محاصل عائد کرنے میں شمسی اور قمری سال کا فرق کیا گیا تھا۔(۶۲) قرۃ کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ان اراضی کو جو اب تک نا قابل زراعت سمجھی جاتی تھیں زراعت کے قابل بنایا۔ برکتہ الجش کو جسے بعد میں ''اصطبل قرۃ'' کہنے لگے تھے اس نے قابل زراعت بنایا اور جہاں تک ہماری تحقیق ہے اُسی نے مصر میں پہلی مرتبہ نے شکر کاشت کی۔(۶۳) ''احیاء الموات'' کا یہ واقعہ معمولی نہیں تھا کیونکہ اسلامی قانون کے مطابق ایسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمینوں کو جو شخص ''زندہ'' کرے وہی اُس کا مالک قرار پاتا ہے۔ اب اگر مسلمان ان زمینوں کو قابل زراعت بنالیں تو وہ صرف عشر ادا کریں گے اور خراج سے بری رہیں گے۔ حالانکہ باقی ماندہ جائدادیں جو خرید وفروخت کے ذریعے مسلمانوں کے قبضے میں آئی تھیں وہ بستی کے مجموعی محاصل میں شریک تھیں۔ ان محاصل سے آزاد رہنے کا بہترین طریقہ ''احیاء الموات'' تھا۔ اس کے علاوہ اس ذریعے سے خالص عرب نوآبادیاں قائم ہوسکتی تھیں۔۹۲ھ میں خلیفہ ولید کے حکم سے قرۃ بن شریک نے جامع مسجد میں اضافہ کیا۔ شعبان ۹۲ھ میں اس کام کا آغاز ہوا اور ۹۴ھ میں نئی تعمیر مکمل ہوگئی۔ قرۃ نے جامع مسجد میں منبر (المنبر الجدید) نصب کرایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے بعد یہ قدیم ترین منبر تھا۔ (۶۴) ۹۶ھ میں قرۃ بن شریک نے ولایت مصر کے دوران میں وفات پائی۔

اب تک مصر میں صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ نظم ونسق کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ۳۵ھ میں عبداللہ بن سعد ابی سرحؓ حضرت عثمانؓ سے ملنے گئے تو انھوں نے ''علی الصلاۃ اور علی الخراج'' دو آدمیوں کا اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔ لیکن یہ انتظام عارضی تھا اور مرکزی حکومت سے کوئی منظوری نہیں لی گئی تھی بلکہ اندرونی طور پر حاکم مصر نے یہ انتظام کر لیا تھا لیکن قرۃ بن شریک کے بعد نظم ونسق کی تقسیم مستقل ہوگئی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت ہی مہتم بالشان تبدیلی تھی کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک عرب ملکی انتظام کے علاوہ مالی معاملات بالکلیہ اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے اور قبطیوں کی اجارہ داری بالکل ختم ہوگئی تھی۔ ولید کی وفات پر خلیفہ سلیمان نے عبدالملک بن رفاعہ کو ۹۶ھ میں مصر کا والی مقرر کیا مگر صرف علی الصلاۃ۔ (۶۵) وہ ۹۹ھ یعنی سلیمان کی وفات تک وہاں رہا اور اس کے ساتھ اُسامہ بن زید التنوخی مصر کا صاحب الخراج مقرر ہو۔ (۶۶) اسامہ بن زید موالئ امیر معاویہ میں سے تھا۔ دمشق کا رہنے والا تھا اور شہزادگی کے زمانے میں یزید بن عبدالملک کا کاتب تھا۔ اس طرح وہ دارالخلافہ کے تجربہ کار افسروں میں سے تھا۔ وہ مصر کا صرف صاحب الخراج مقرر ہوا تھا مگر اس کی شخصیت کا اثر اتنا تھا کہ طبری اور ابن الاثیر دونوں اسے حاکم مصر لکھتے ہیں۔ (۶۷) مقریزی نے لکھا ہے خلیفہ سلیمان کے زمانے میں اُسامہ بن زید نے مصر سے ایک کروڑ بیس لاکھ دینار بطور محاصل وصول کئے تھے۔ (۶۸) بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اسامہ سے سخت ناراض تھے۔ چنانچہ ۹۹ھ میں سلیمان کی وفات کے وقت اُسامہ بدستور مصر کا صاحب الخراج تھا لیکن عمر بن عبدالعزیز کی ناراضگی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے سلیمان کے دفن ہونے سے قبل اُس کی قبر کے قریب بیٹھ کر اُسامہ کی معزولی کا حکم لکھا۔ (۶۹)

مالیاتی وانتظامی امور میں تبدیلیاں

خلیفہ ہوتے ہی عمر بن عبدالعزیز نے مالیات کے مسائل پر غور کیا۔ انھوں نے اس ضمن میں جو کیا وہ اہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی تھا اور دیر پا بھی۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ مالیات میں جو ابتری واقع ہو رہی ہے اُسے روک دیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اس ابتری کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تنظیم اراضی میں خرابی واقع ہو رہی تھی۔ اس لئے انھوں نے دو کام کئے۔ اول تو انھوں نے وہ تمام قطائع جو ان کے پیشرو اپنے اہل خاندان کو دے گئے تھے واپس لے کر عامۃ المسلمین کو دے دیئے اور اس کے علاوہ حکم دیا کہ اب مسلمان زمینیں نہ خریدیں۔(۷۰) دوم انھوں نے مصر کے عمال کو فوراً تبدیل کیا۔ عبدالملک بن رفاعہ کی جگہ ایوب بن شرجیل بن اکسوم ''علی الصلاۃ'' اور اُسامہ بن زید کی جگہ حیان بن شریح کو ''صاحب الخراج'' مقرر کیا گیا۔نظم ونسق پہلے کی طرح اب بھی دو حصوں میں منقسم رہا۔

ابن عبد الحکم نے بیان کیا ہے کہ حیان بن شریح نے تجویز کی تھی کہ جو قبطی مر گئے ہیں ان کا جزیہ زندہ قبطیوں پر لگایا جائے۔ خلیفہ نے عراک بن مالک سے مشورہ کیا اور عراک نے یقین دلایا کہ ان کا اور ہمارا کوئی عہد نہیں اور وہ بمنزلہ غلام کے ہیں۔(۷۱) اس پر حیان کی تجویز منظور کر لی گئی۔ ایک روایت اسی کتاب میں یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے خود ہی حیان بن شریح کو لکھا تھا کہ مصر بزور شمشیر فتح ہوا ہے اور اہل مصر کے ساتھ ہمارا کوئی عقد یا عہد نہیں ہے۔(۷۲) لیث بن سعد نے عمر بن عبد العزیزؒ سے روایت کی ہے کہ جزیہ سروں پر لگایا جاتا ہے، زمینوں (جائیداد غیر منقولہ) پر نہیں لگایا جاتا۔ اس سے ان کی مراد اہل الذمہ ہیں۔(۷۳) اس کے علاوہ لیث بن سعد سے ایک دوسری روایت ہے کہ عمر بن عبد العزیز نے ان ذمیوں پر جو اسلام لے آئے تھے جزیہ اٹھا لیا تھا اور ان نو مسلموں کو ان عرب عشائر کے ساتھ دیوان میں ملحق کر دیا تھا جن کے ہاتھ پر وہ مسلمان ہوئے تھے، حالانکہ اس سے قبل ذمی مسلمانوں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔(۷۴) ان روایات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عمر بن عبد العزیز کے نزدیک مصر بزور شمشیر فتح ہوا تھا اور جزیہ قریوں پر لگایا گیا تھا۔ اہل قریہ میں سے جو مر جائے اس کا جزیہ بہر حال قائم رہتا تھا اور کسی صورت میں قابل معافی نہیں تھا۔(۷۵)

ہمارے نزدیک مندرجہ بالا روایات میں جہاں کہیں جزیہ کا لفظ آیا ہے وہاں اس سے قبل مراد ''فی کس محصول'' نہیں بلکہ وہی پرانا خراج (باج) ہے۔ عمر بن عبد العزیزؒ سے قبل نو مسلموں پر اس خراج کا جسے جزیہ کہا گیا ہے بار اتنا ہی تھا جتنا کہ اہل ذمہ پر۔ آپ نے یہ تبدیلی کی کہ نو مسلموں پر سے جزیہ اُٹھا کر انھیں دیوان میں شریک کر لیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح نو مسلم جب جزیہ سے بری کر دیے گئے اور دیوان سے انھیں فریضہ (وظیفہ) ملنے لگا تو محاصل میں کمی ہوئی اور اخراجات میں اضافہ ہوا۔ اس سے میزانیہ میں خلل واقع ہو رہا تھا۔ ایک حد تک حیان نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ خلیفہ کی اجازت سے مرنے والے قبطیوں کا جزیہ زندہ قبطیوں سے وصول کیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بھی میزانیہ میں توازن قائم نہ ہو سکا اور قبطیوں پر سرکاری محاصل کا بوجھ بڑھ گیا۔ پھر لگان اراضی کی کمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو روکنے کی ترکیب ان کے خیال میں آئی کہ مسلمانوں کے لئے زمین خریدنا ممنوع قرار دیں تا کہ خراجی اراضی عشری اراضی میں تبدیل نہ ہونے پائیں۔ یہ تو وہ محاصل تھے جو اسلام میں قانوناً جائز سمجھے جاتے تھے۔لیکن ان کے علاوہ رومی عہد کے دوسرے محاصل رفتہ رفتہ دوبارہ زندہ ہو رہے تھے۔(۷۶) محاصل کی اس نئی تنظیم کے علاوہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۹۹ھ میں ایوب بن شرجیل کو حکم دیا تھا کہ عطایا میں اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ پچیس ہزار دینار حاجت مندوں میں تقسیم کئے گئے۔(۷۷) دو باتیں قابل توجہ ہیں ایک طرف تو جو ذمی مسلمان ہو گئے باوجود غیر عرب ہونے کے دیوان میں شریک کیے گئے اور اس طرح دیوان خالصۃً عربوں کے لئے مخصوص نہیں رہا۔ دوسرے قبطی اپنے پرانے مواریث سے بے دخل ہوئے اور مسلمانوں نے ان کی جگہ لے لی۔

مصر کی آخری تدوین اور مردم شماری

عمر بن عبدالعزیزؒ کے جانشین یزید بن عبدالملک نے شروع میں ایوب بن شرجیل کو ولایت مصر پر بحال رکھا لیکن چونکہ نیا خلیفہ اپنے پیشرو کی مخالفت پر اڑا ہوا تھا اس لئے رمضان ۱۰۱ھ میں اُسے معزول کر کے بشر بن صفوان کو مقرر کیا۔(۷۸) ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایوب کی موت کے بعد (۱۷ رمضان ۱۰۱ھ) بشر بن صفوان کا تقرر ہوا تھا۔(۷۹) مگر اصلیت یہ ہے کہ یہ تبدیلی ایوب کی زندگی میں ہو چکی تھی اور بشر اُس کی موت کے بعد مصر پہنچا تھا۔ مصر کے اہل دیوان کے عطایا میں جو اضافہ عمر بن عبدالعزیز نے کیا تھا وہ خلیفہ یزید کے حکم کے مطابق منسوخ کیا گیا۔ بشر کی مختصر سی ولایت کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ اس کے زمانے میں چوتھی اور آخری تدوین عمل میں آئی۔ الکندی نے اس کی یہ وجہ بتائی ہے کہ بشر نے دیکھا کہ قضاء کے لوگ مختلف قبائل میں منتشر ہیں۔ اس لیے اس نے خلیفہ سے اجازت چاہی کہ انھیں یکجا کر کے ان کا دیوان الگ کر دیا جائے۔(۸۰) بشر بن صفوان کا عہد حکومت بہت ہی مختصر رہا۔۱۰۲ھ میں اُسے حکومت افریقہ منتقل کر کے اُس کے بھائی حنظلہ کو مصر میں اس کا جانشین بنایا گیا۔ اس کے زمانے میں ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ میں خلیفہ یزید کے حکم سے مصر کے قدیم بت توڑے گئے اور تصویریں مٹائی گئی گئیں۔(۸۱) لیکن اب خلیفہ یزید نے ایسے شخص کو مصر کا صاحب الخراج مقرر کیا کہ والیان مصر کے بجائے ہماری تمام توجہ اسی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ شخص عبیداللہ بن الحجاب مولائے بنی سلول تھا(۸۲) جس کا نام عبداللہ بن الحجاب بھی لکھا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ تقرر کے متعلق بیکر کو بہت شبہ ہے اور آخر اُس نے ابن تغری کی پیروی میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ۱۰۴ھ میں مصر کا صاحب الخراج مقرر ہوا تھا۔(۸۳) اس کے برعکس گروہمان اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حنظلہ بن صفوان (۱۰۲ھ سے ۱۰۵ھ) سے قبل ہی وہ صاحب الخراج مقرر ہو چکا تھا کیونکہ حیان بن شریح کے بعد پتہ نہیں چلتا کہ ۱۰۴ھ تک مصر کا صاحب الخراج کون رہا تھا۔ غالباً یہی وہ زمانہ ہے جب ۱۰۱ھ یا ۱۰۳ھ میں عبیداللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بن الحجاب کا تقرر ہوا ہے۔(۸۴)

عمرو بن العاصؓ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کے بعد مصر کا خراج فساد کے بڑھ جانے اور اکثر اراضی کی تباہی اور جنگوں کی وجہ سے برابر گھٹتا گیا اور بنو امیہ اور بنو عباس کے خلفا تیس لاکھ دینار سے زیادہ وصول نہ کر سکے۔ سوائے ہشام کے جس نے عبیداللہ کو حکم دیا تھا کہ مصر کو آباد کرنے پر توجہ کرے۔ مقریزی کے مطابق اُس نے ذاتی طور پر تمام ملک کا دورہ کیا اور غیر آباد زمینوں کی جہاں تک وہ دریائے نیل سے سیراب ہوتی تھیں پیمائش کی۔ اُس نے دیکھا کہ تین کروڑ فدان (ایکڑ) زمین اُن زمینوں کے علاوہ تھی جو طغیانی کی سرحد سے بلند تھیں اور یہ وہ زمینیں تھیں جو خس و خاشاک سے پر ہو کر ناقابل زراعت ہو گئی تھیں۔ اس نے ان سب کی فہرست تیار کی اور انتہائی عدل کے ساتھ انھیں دوبارہ تقسیم کیا۔(۸۵) نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے چالیس لاکھ دینار خراج وصول کیا حالانکہ غلہ سستا تھا اور ملک میں کوئی اور محصول یا چونگی بھی نہ تھا۔ ابن خرداذبہ نے لکھا ہے کہ عبیداللہ نے ستائیس لاکھ تیئیس ہزار آٹھ سو انتالیس دینار وصول کئے تھے۔(۸۶) یہاں ابن خرداذبہ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ درحقیقت یہ وہ رقم تھی جو اہل مصر کے عطیات اور دیگر اخراجات کے بعد دمشق کے مرکزی خزانے کو روانہ کی گئی تھی۔

سیوطی نے لیث بن سعد سے روایت کی ہے کہ جب ولید بن رفاعہ والئی مصر ہوا تو وہ ملک کی مردم شماری کے لئے نکلا اور یہ بھی دیکھنا چاہا کہ خراج میں تعدیل سے کام لیا جا رہا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اس نے چھ مہینے مصر صعید کا دورہ کیا اور اُسوان تک پہنچا۔ کاتبوں اور مددگاروں کی ایک جماعت اس کے ساتھ تھی جو اس کام کو بڑی تندہی سے جلدی جلدی انجام دیتے تھے۔ مصر اسفل میں اُس نے تین مہینے صرف کئے۔ اُس نے قریوں میں دس ہزار قریے شمار کئے جن میں وہ گاؤں شامل نہیں تھے جن کی آبادی پانچ سو سے کم تھی اور جزیہ دینے والوں میں سے پچاس لاکھ آدمی شمار کئے۔(۸۷) ابن رفاعہ کی یہ تحقیق اور مردم شماری کیا نئی چیز تھی یا اس نے محض اس کام کو جاری رکھا تھا جو ابن الحجاب شروع کر چکا تھا؟ قرین قیاس یہ ہے کہ ابن رفاعہ نے یہ کام جاری رکھا تھا اور وہ یہ دیکھنے نکلا تھا کہ ابن الحجاب کے بنائے ہوئے قواعد پر صحیح طور پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔

بنو امیہ کا زوال اور بنو عباس کی اصلاحات

عبیداللہ بن الحجاب اور ولید بن رفاعہ کی اصلاحات پہلی صدی ہجری کی آخری اصلاحات تھیں اور یہی زمانہ مصر میں عرب حکومت اور عرب قوم کے انتہائی عروج کا بھی تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اصلاحات کی وجہ سے جزیہ اور خراج میں فرق قائم کیا گیا اور پرانے جزیہ یا خراج کو باقی رکھ کر نئی پیمائش کے مطابق لگان اراضی عائد کیا گیا۔ اس کے بعد خلیفہ ہشام کے زمانے میں کسی بڑی تبدیلی کا ذکر نہیں ملتا۔ خلیفہ کا انتقال ۱۲۵ھ میں ہوا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سات سال بعد ۱۳۲ھ میں بنوامیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ ان انقلابات سے مصر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ چنانچہ اسی سات سال کے عرصے میں ہمیں یہ عجیب و غریب بات دکھائی دیتی ہے کہ عرب خود اپنی ہی حکومت اور حاکم کے خلاف متعدد مرتبہ شورش اور فساد برپا کرتے ہیں اور حالات میں سکون پیدا کرنے کے بجائے انتشار میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود بنوامیہ کے افراد بھی جو مصر میں موجود تھے نہایت ناعاقبت اندیشی سے ان شورشوں میں حصہ لیتے ہیں اور مصر میں اپنے خاندان کی حکومت کو تباہ کرنے میں بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔

۱۳۲ھ میں اہل مصر نے برضا و رغبت اپنا ملک نئے خاندان خلافت کے سپرد کر دیا۔ بنوعباس اپنے آپ کو ابتداء ہی سے بڑی حد تک عربوں سے مستغنی سمجھتے تھے اور عراق میں ان کی حکمت عملی شروع ہی سے یہ تھی کہ خراسانیوں یا عجمیوں کو عربوں پر ترجیح دی جائے۔ شروع میں مشرقی صوبوں کے حاکم ضرور خاندان خلافت سے ہوتے تھے مگر ان سب کے مشیر اور مددگار عجمی تھے۔ مصر کے حالات اس سے مختلف تھے۔ اول تو وہاں عربوں کا اقتدار اس قدر مستحکم تھا کہ انھیں فوراً بے دخل کرنا ناممکن بھی تھا اور پرخطر بھی۔ دوسرے چند ہی سال قبل عربوں کی نو آبادی میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر جو اضافہ ہوا تھا اُس سے ان کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ انہیں نظر انداز کرنا آسان نہیں تھا۔ لہٰذا کم و بیش سو برس تک بنوعباس نے عربوں کو ان کی جگہ پر قائم رکھا اور مصر کے تمام ملازمین عرب ہی رہے۔ مگر ناممکن تھا کہ یہ حالات ہمیشہ باقی رہتے۔

مصر پر قبضہ کرنے کے بعد خلیفہ ابو العباس سفاح نے اپنے چچا صالح بن علی کو وہاں کا ''علی الصلاۃ و الخراج'' حاکم مقرر کیا۔ اول تو اُس نے بنوامیہ کے ہمدردوں کو گرفتار کرا کے قتل کرایا اور پھر بنوامیہ کے افراد کو جن میں عبدالعزیز بن مروان کی اولاد بھی شامل تھی گرفتار کرایا لیکن انھیں بجائے مصر میں قتل کرانے کے فلسطین کے شہر قلنسوہ میں لے جا کر قتل کیا گیا۔(۸۸) اس سخت گیری کے ساتھ ساتھ صالح بن علی نے ''مقاتلہ'' اور ان کے خاندانوں میں عطیات اور یتیموں اور مسکینوں میں صدقات تقسیم کئے۔ اس نے ان لوگوں میں قطائع بھی تقسیم کیے جنھوں نے سیاہ رنگ اختیار کر لیا تھا۔ الکندی نے ان لوگوں کے نام بھی لکھے ہیں جنھیں یہ قطائع دیئے گئے تھے۔(۸۹) اب قطائع کی حیثیت وہ نہیں تھی جو ہم مروان بن عبدالعزیز کے زمانے میں دیکھ آئے ہیں بلکہ ہر لحاظ سے باقاعدہ جاگیریں تھیں۔ صالح بن علی نے فسطاط کی مسجد میں بھی اضافہ کرایا۔ اسی عہد میں پہلی مرتبہ ''دیوان الجند'' کا بھی ذکر آتا ہے۔(۹۰) خلیفہ ابوجعفر منصور کی طرف سے یزید بن حاتم المہلبی ذی القعدہ ۱۴۴ھ میں حاکم مقرر ہو کر مصر پہنچا اور ۱۵۲ھ تک وہاں رہا۔ اس کے عہد میں تو مصر میں پہلی مرتبہ بنوعلیؑ کی دعوت کا ظہور ہوا اور بنوحسن میں سے علی بن محمد بن عبداللہ بن حسن پہلے علوی تھے جو مصر میں داخل ہوئے۔(۹۱) مگر ذی الحجہ ۱۴۵ھ میں جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابراہیم بن عبداللہ کا سر مصر میں گشت کرانے کے لئے بھیجا گیا تو یہ دعوت بالکل ختم ہو گئی۔

سماجی، تہذیبی اور معاشی امور میں عربوں کا نفوذ

اصل یہ ہے کہ اب تک مصر میں ایک بہت بڑی معاشرتی، سیاسی اور معاشی تبدیلی ہو چکی تھی۔ ابن الحجاب کی کوششوں کا صریحاً نتیجہ یہ ہوا تھا کہ عرب باقاعدہ طور پر زراعت میں لگ گئے تھے اور حکومت نے انھیں اس میں مدد دی تھی۔ گو ابتدائی عہد میں زراعت کرنا عربوں کے لئے قانوناً منع تھا لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ اس طرف سے ہمیشہ غافل رہے تھے۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ زمینوں پر قابض ہوتے جا رہے تھے اور اس وقت تک باقاعدہ طور پر زمینوں سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جوں جوں عرب اراضی پر آباد ہوتے گئے اور جوں جوں اسلام اور عربی تہذیب پھیلتی گئی عرب عناصر کا زور ملک میں بڑھتا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ قبطیوں سے عربوں کا میل جول بھی بڑھا اور آہستہ آہستہ دونوں قوموں کے مفاد جو اب تک الگ الگ تھے ایک ہوتے چلے گئے۔ دونوں میں اتحاد قائم ہو گیا اور امتیازات اٹھتے گئے۔ عربوں کے سیاسی اور معاشرتی تفوق کے خاتمے کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ عربوں نے ان محاصل کے خلاف احتجاج کیا جو خود انہیں کی حکومت نے عائد کئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب وہ حاکم اور مالک کی حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ عام آدمی کا ایک جزء بن گئے تھے۔

قبطیوں اور عربوں کی باہمی بغاوتیں

عرب اب ریاست کے مددگار ہونے کے بجائے ایک مصیبت ثابت ہو رہے تھے۔ چنانچہ ۱۶۳ھ میں عربوں ہی کی وجہ سے ملک میں بدامنی کا اس حد تک دور دورہ ہوا اور راستے اس قدر غیر محفوظ ہو گئے کہ ایک سخت گیر حاکم یحییٰ بن داؤد کو مصر بھیجا گیا۔ سخت گیری کے باوجود مورخ اس کی قابلیت کے ثناء خواں ہیں۔ اُس نے امن و امان قائم کیا اور حکم دیا کہ رات کو کوئی شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے نہ سوئے اگر چوری ہو گئی تو تمام مال کی واپسی کا وہ خود ذمہ دار ہو گا۔(۹۲) لیکن ۱۶۷ھ میں پھر بدامنی کا دور دورہ ہوا اور اس وقت بھی اس کی ذمہ داری عربوں پر تھی۔ اسحاق بن سلیمان عباسی (امیر مصر) نے ۱۷۸ھ میں مزارعین کے خراج میں اضافہ کیا۔ اس پر اہل حوف الشرقی نے بغاوت کی اور اسحاق کے خلاف لشکر تیار کیا۔ اسحاق ان کے مقابلے میں ناکام رہا اور بالآخر خلیفہ ہارون الرشید سے مدد مانگنے پر مجبور ہوا۔ خلیفہ نے ہرثمہ بن اعین کو مصر بھیجا جس نے اہل حوف کو سمجھا بجھا کر مطیع کر لیا اور انھوں نے خراج بھی ادا کر دیا۔(۹۳) ۱۸۶ھ میں لیث بن فضل کے خلاف اہل حوف نے بغاوت کی۔ وجہ یہ ہوئی کہ لیث نے اراضی کی نئی پیمائش کرائی تھی اور پیمائش کرنے والوں نے قبضہ میں چند انگشت کی کمی کر دی تھی۔ اہل حوف نے شکایت کی اور جب شنوائی نہ ہوئی تو انھوں نے فسطاط پر چڑھائی کر دی۔ لیث مقابلے کے لئے نکلا۔ اس موقعے پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی مستقل فوج نے غداری کی۔ مگر اس کے باوجود وہ مفسدوں پر غالب آیا اور اہل حوف ناکام اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ ۱۸۷ھ میں لیث بن فضل معزول ہوا اور احمد بن اسماعیل امیر مصر مقرر کیا گیا۔ (۹۴) ۱۹۱ھ میں ایک ایسی ہی بغاوت خراج کی ادائی کے متعلق حسین بن جمیل کے عہد ولایت میں ہوئی۔ یہ بغاوت اتنی خطرناک تھی کہ اس کے اثرات شام تک پہنچے اور بالآخر ہارون الرشید نے اپنے ایک افسر یحییٰ بن معاذ کو مصر بھیجا۔ یحییٰ بن معاذ نے بغاوت فرو کی اور واپس جاتے وقت قیسہ اور یمانیہ کے دو رئیسوں کو فسطاط بلا کر دھوکے سے گرفتار کر لیا۔

مصر میں ترکوں کا نفوذ اور اس کے اسباب

۲۱۳ھ میں مامون نے مصر کو اپنے بھائی معتصم کے سپرد کر دیا تھا اور اس وقت سے معتصم ہی وہاں کا والی مقرر اور معزول کرتا تھا۔ محض ''کیدر'' ایک والی تھا جو مامون کی طرف سے مقرر ہوا تھا۔ (۹۵) ۲۱۴ھ میں جب معتصم مصر آیا تو حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس کے دو سال بعد ہی ۲۱۶ھ میں سب سے زیادہ خطرناک بغاوت ہوئی جس میں قبطیوں اور عربوں نے پھر متحدہ محاذ قائم کیا۔ معتصم کی طرف سے عیسیٰ بن منصور حاکم تھا اور حوف الشرقی کی یہ بغاوت اس کے عمال کی بد اعمالی کا نتیجہ تھی۔ باغیوں نے عمال کو نکال دیا۔ حکومت اب بالکل مجبور تھی اور ہر طرف فتنہ فساد کا بازار گرم تھا۔ مشہور ترک سپہ سالار افشین بغاوت کو فرو کرنے آیا مگر ناکام رہا۔ بالآخر مامون کو اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے خود آنا پڑا۔ ۱۲ صفر ۲۱۷ھ کو مامون بغداد واپس چلا گیا۔ ۲۱۸ھ میں مامون کی وفات پر معتصم خلیفہ ہوا۔ اس نے کیدر (حاکم مصر) کو اپنی بیعت کی اطلاع دی اور ساتھ ہی حکم دیا کہ دیوان سے عربوں کے نام کاٹ دیئے جائیں اور ان کے عطیات بند کر دیے جائیں کیدر نے اس پر عمل کیا۔ (۹۶) مصر میں عربوں کی اصلی اہمیت قدرتی طور پر فوجی خدمت سے وابستہ تھی اور جب یہ خدمت ان کے ہاتھ میں نہ رہی تو ظاہر ہے کہ وہ تمام سیاسی اقتدار بھی کھو بیٹھے اور عام مصریوں میں مل جل گئے۔

عربوں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے معتصم ترکوں کی فوج اپنے ساتھ لایا تھا۔ اب معتصم نے عربوں کے عطیات مسدود کرائے اور اس سے بھی زیادہ دور رس تبدیلی یہ ہوئی کہ ۲۱۹ھ میں اُس نے ایک ترک امیر اشناس کو ملک مصر جاگیر میں دے دیا اور مصر میں منبروں پر سے اُس کے لئے دعا کی گئی۔ (۹۷) یہ ایسی سرفرازی تھی کہ اس سے قبل کسی والئ مصر کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ والی کا تقرر اور تعزل بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا۔ ۲۳۰ھ میں اشناس کا انتقال ہوا تو ایک اور ترک امیر ایتاخ مصر میں اس کا جانشین ہوا۔ اب عربوں کا زوال مکمل ہو چکا تھا اور مصر ترک امیروں کی جاگیر کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھر بھی ۲۴۲ھ تک عرب والی مقرر ہوتے رہے۔ آخری عرب حاکم مصر عنبسہ بن اسحاق الضبی تھا اور وہی آخری حاکم تھا جس نے لوگوں کے ساتھ صلاۃ میں شرکت کی۔ (۹۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلاصہ بحث

۲۰ ھ سے ۲۴۲ھ تک کم وبیش ۲۲۲ سال مصر پر عربوں کی حکومت رہی ۔۲۴۲ھ میں عربوں کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ ہوا اور اس کے بعد ترکوں کا دور شروع ہوا۔عہد فاطمین میں ابتداًء بربری قبیلہ کتامہ کا زور رہا مگران کی سرزوری سے خلیفہ العزیز مالیہ (۳۶۵ھ سے ۳۸۶ھ) کو مجبوراً توازن قوت قائم رکھنے کے لئے ترکوں کو مصر آنے کی دعوت دینی پڑی۔ اس کے بعد ترک مصر کی سیاسیات پر پھر غالب آئے۔ اگر اس مختصر سے زمانے کو نظر انداز کر دیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ترک اب صدیوں سے ملک کے مالک اور حکمران تھے۔مگر عربوں نے اپنے جو آثار مصر میں چھوڑے اور جو اب تک اپنا کام کر رہے ہیں وہ اس قدر ظاہر و باہر ہیں کہ ان پر بحث کرنا تحصیل لا حاصل ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(1) Arnold,W.T: Roman System of Provincial Administration, Oxford, 1914,P:130

(۲) ابوعبداللہ،محمد بن سعد،الطبقات الکبریٰ،دارالکشاف، بیروت،۱۹۶۰ء،ج۳،ص۲۲۴

(۳) ابن عبدالحکم،ابوالقاسم عبدالرحمٰن، فتوح مصر و اخبارھا،بریل لیدن،۱۹۲۰ء،ص۵۳

(۴) الکندی،ابوعمر محمد بن یوسف،کتاب الولاۃ والقضاۃ،مطبعۃ السعادۃ،مصر،۱۹۰۸ء،ص۱۰۔۹

(۵) المراکشی،ابن العذاری، البیان المغرب فی اخبار المغرب، بریل لیدن، ۱۸۴۸ء،ج۱،ص۹

(۶) الکندی،ابوعمر محمد بن یوسف،کتاب الولاۃ والقضاۃ،ص۱۲

(۷) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ، بولاق،۱۲۷۰ھ،ج۱،ص۲۰۰

(۸) الکندی،ابوعمر محمد بن یوسف،کتاب الولاۃ والقضاۃ،ص۱۱

(۹) السیوطی، جلال الدین، حسن المحاضرہ فی اخبار مصر و القاھرہ،دار احیاء الکتب العربیہ، مصر، ۱۹۶۷ء،ج۱،ص۷۷۔۷۶

(۱۰) ابن عبدالحکم،ابوالقاسم عبدالرحمٰن، فتوح مصر و اخبارھا،ص۹۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۱) المقریزی، تقی الدین احمد بن علی، کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار، ج۱،ص۲۹۷

(۱۲) ابن عبد الحکم اور مقریزی نے اس کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ ملاحظہ ہو: فتوح مصر و اخبارھا، ص۱۴۳۔۱۴۱ اور کتاب المواعظ، ج۱،ص۲۶۱۔۲۶۰

(۱۳) ابن عبد الحکم، ابوالقاسم عبدالرحمٰن، فتوح مصر و اخبارھا، ص۱۴۲

(۱۴) السیوطی، جلال الدین، حسن المحاضرہ فی اخبار مصر و القاھرہ، ج۱،ص۷۶۔۷۵

(۱۵) المقریزی، تقی الدین احمد بن علی، کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار، ج۱،ص۷۹

(۱۶) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف، کتاب الولاۃ والقضاۃ، ص۶۸

(۱۷) ابن تغری بردی، جمال الدین، النجوم الزاھرہ فی ملوك المصر والقاھرہ، ج۱،ص۲۷۲

(۱۸) المقریزی، تقی الدین احمد بن علی، کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار، ج۱،ص۷۶

(۱۹) البلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر، فتوح البلدان، شرکۃ طبع الکتب العربیۃ، مصر، ۱۳۱۹ھ، ص۳۳۱۔۳۲۶

(۲۰) اس کا ذکر ابن عبد الحکم نے فتوح مصر و اخبارھا، ص۱۴۲ اور مقریزی نے کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار، ج۱،ص۷۶ میں کیا ہے۔ لیکن ضیافت کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الشافعی، محمد بن ادریس، کتاب الام، المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ، بولاق ۱۳۲۲ھ، ج۴،ص۱۲۴۔۱۲۳

(12) Becker,Charles: Beitrage Zur Geschichte Agyptens unter den Islam,Strassburg,1903Vol:2,P:84

(۲۲) المقریزی، تقی الدین احمد بن علی، کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار، ج۱،ص۹۸۔ سیوطی (حسن المحاضرہ، ج۱،ص۸۷) کے مطابق ۲۰ھ میں عمر بن العاصؓ نے دس لاکھ دینار اور ۲۳ھ میں بابلیون کی فتح کے بعد ایک کروڑ بیس لاکھ دینار خراج وصول کیا تھا۔ تاہم بلاذری نے (فتوح البلدان، ص۲۲۳ میں) بیس لاکھ لکھا ہے۔ بٹلر (Buttler) کے مطابق یہ راقم کی غلطی ہے کہ ایک کروڑ حذف ہوگیا اور محض بیس لاکھ رہ گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: Buttler,Alfred: The Arab conquest of Egypt,Oxford,1922,P:453-454

(23) Becker,Charles: Beitrage Zur Geschichte Agyptens unter den Islam,Vol:2,P:88

(۲۴) البلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر، فتوح البلدان، ص۶۷۔۶۶

(۲۵) ابی الفرج، عبدالرحمٰن بن احمد، الاستخراج لاحکام الخراج، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۵ء، ص۵

(26) Milne: Egypt under the Roman Rule,Oxford,1898,P:119-125

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(27) Buttler,Alfred: The Arab conquest of Egypt,P:453-454

(۲۸) الخوارزمی، ابوعبداللہ محمد بن احمد، مفاتیح العلوم، بریل لیدن، ۱۳۴۹ھ، ج۵، ص۵۰

(۲۹) البلاذری، احمد بن یحیٰ بن جابر، فتوح البلدان، ص۲۲۴۔۲۲۳

(۳۰) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف، کتاب الولاۃ والقضاۃ، ص۶۸

(۳۱) ابن تغری بردی، جمال الدین، النجوم الزاھرہ فی ملوك المصر والقاھرہ، مطبعۃ دار الکتب المصریۃ بالقاہرۃ، مصر، ۱۹۳۰ء، ج۱، ص۲۱۴

(۳۲) ایضاً، ج۱، ص۲۲۹

(۳۳) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف، کتاب الولاۃ والقضاۃ، ص۵۱

(۳۴) کتاب المواعظ (ج۱، ص۳۰۰) میں سلیم بن عمیر کا نام سلیمان بن عنتر اور کتاب الولاۃ والقضاۃ (ص۱۴) میں سلیمان بن عمیر التجیبی لکھا گیا ہے۔لیکن ابن تغری نے النجوم الزاھرہ فی ملوك المصر والقاھرہ (ج۱، ص۱۰۳) میں سلیم بن عمیر لکھا ہے اور بعض قرآئن سے جس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

(۳۵) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف، کتاب الولاۃ والقضاۃ، ص۳۲۱

(۳۶) ابن تغری بردی، جمال الدین، النجوم الزاھرہ فی ملوك المصر والقاھرہ، ج۱، ص۱۷۵

(۳۷) ایضاً، ج۱، ص۲۳۳

(۳۸) ایضاً، ج۱، ص۱۸۴

(۳۹) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف، کتاب الولاۃ والقضاۃ، ص۴۷

(۴۰) ایضاً، ص۴۸

(۴۱) یاقوت حموی، معجم البلدان، دار صادر، بیروت، ۱۹۵۷ء، ص۱۳۱

(۴۲) المقریزی، تقی الدین احمد بن علی، کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار، ج۱، ص۳۰۲

(۴۳) ابن تغری بردی، جمال الدین، النجوم الزاھرہ فی ملوك المصر والقاھرہ، ج۱، ص۲۷۲

(۴۴) ابن عبدالحکم، ابوالقاسم عبدالرحمٰن، فتوح مصر و اخبارھا، ص۱۹۵

(۴۵) ابن تغری بردی، جمال الدین، النجوم الزاھرہ فی ملوك المصر والقاھرہ، ج۱، ص۱۸۴

(۴۶) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف، کتاب الولاۃ والقضاۃ، ص۵۱

(۴۷) ابن عبدالحکم، ابوالقاسم عبدالرحمٰن، فتوح مصر و اخبارھا، ص۹۸

(۴۸) ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، مصطفٰی البابی الحلبی، مصر، ۱۲۴۶ھ، ص۱۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴۹) قطائع کی ابتداء کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے دیکھئے:ابن عساکر، ابو القاسم علی بن الحسن ،التاریخ الکبیر،مکتبہ ہاشمیہ، دمشق، ۱۳۲۹ھ، ج ۱،ص۱۸۴۔۱۸۲ ۔اسی طرح فتوح مصر و اخبارھا،ص۱۳۹۔۱۳۲ نیزمفاتیح العلوم،ج۵،ص۳۹ میں بھی کافی معلومات ملتی ہیں۔

(۵۰) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۹۶

(۵۱) ابن عبدالحکم،ابوالقاسم عبدالرحمٰن ،فتوح مصر و اخبارھا،ص۱۵۴

(۵۲) ایضاً،ص۸۶

(۵۳) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۷۸۔۷۷

(۵۴) ابن عبدالحکم،ابوالقاسم عبدالرحمٰن، فتوح مصر و اخبارہا،ص۲۳۵

(۵۵) ایضاً،ص۱۵۶

(۵۶) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۲،ص۴۹۲

(۵۷) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف،کتاب الولاۃ والقضاۃ،ص۵۵

(۵۸) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۹۸

(59) Becker,Charles: Beitrage Zur Geschichte Agyptens unter den Islam,Vol:2,P:130

(۶۰) تفصیل کے لیے دیکھئے: کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۳۰۲۔ابن تغری بردی نے النجوم الزاهره فی ملوك المصر والقاهره،ج۱،ص۲۳۳۔البتہ سیوطی نے حسن المحاضره فی اخبار مصر و القاهره ،ج۱،ص۷۶۔۷۵ میں مکیس کی بجائے تکیس لکھا ہے۔

(۶۱) کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۷۷ کے الفاظ ہیں''وضع عمر بن عبد العزیز الجزیة علی من اسلم من اهل الذمة'' تاہم علی کی جگہ عن پڑھنا درست ہوگا۔اسی کتاب کے صفحہ ۷۸ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

(62) Becker,Charles: Beitrage Zur Geschichte Agyptens unter den Islam,Vol:2,P:100

(۶۳) ابن عبدالحکم،ابوالقاسم عبدالرحمٰن ،فتوح مصر و اخبارھا،ص۱۲۶

(۶۴) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف،کتاب الولاۃ والقضاۃ،ص۶۵

(۶۵) ابن تغری بردی، جمال الدین ،النجوم الزاهره فی ملوك المصر والقاهره،ج۱،ص۱۰۳

(۶۶) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۵۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(٦٧) تفصیل کے لیے دیکھئے:تاریخ ابن کثیر،مصطفیٰ البابی الحلبی،مصر ۱۳۰۱ھ،ج ۵،ص۴۹اورتاریخ طبری،مکتبۃ العلم، بیروت،۱۹۶۰ء،ج۲،ص۴۳۶

(٦٨) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۹۹

(٦٩) ابن تغری بردی، جمال الدین،النجوم الزاهره فی ملوك المصر والقاهره،ج۱،ص۲۵۸۔اسامہ بن زید اور یزید بن ابی مسلم (کاتب حجاج بن یوسف) دونوں کی معزولی کا حکم بوقت واحد دیا گیا۔

(70) Das Arabischen Reict and Stein sturse,Berlin,1902,P:267

اس کتاب میں مصنف نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مالی حکمت عملی پر مفصل گفتگو کی ہے۔

(٧١) ابن عبدالحکم، ابوالقاسم عبدالرحمٰن، فتوح مصر و اخبارها،ص۸۹

(٧٢) ایضاً،ص۹۰

(٧٣) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۷۷

(٧٤) ابن عبدالحکم، ابوالقاسم عبدالرحمٰن، فتوح مصر و اخبارها،ص۱۵۶

(٧٥) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۷۷

(76) Becker,Charles: Beitrage Zur Geschichte Agyptens unter den Islam,Vol:2,P:107

(٧٧) ابن تغری بردی، جمال الدین،النجوم الزاهره فی ملوك المصر والقاهره،ج۱،ص۲۶۴

(٧٨) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف،کتاب الولاۃ والقضاۃ،ص۶۹

(٧٩) ابن تغری بردی، جمال الدین،النجوم الزاهره فی ملوك المصر والقاهره،ج۱،ص۲۷۲

(٨٠) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف،کتاب الولاۃ والقضاۃ،ص۷۱-۷۰

(٨١) ابن تغری بردی، جمال الدین،النجوم الزاهره فی ملوك المصر والقاهره،ج۱،ص۲۷۸

(٨٢) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۲۶۱

(83) Becker,Charles: Beitrage Zur Geschichte Agyptens unter den Islam,Vol:2,P:107

(84) Grohmann,Adolf: Allgemein Einfuhrung in die arabichen Papyri,Wein,1924,P:49

اس کتاب میں دیگر والیان مصر کے متعلق بھی مفید معلومات دستیاب ہوئی ہیں۔

(٨٥) المقریزی،تقی الدین احمد بن علی،کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار،ج۱،ص۱۰۰-۹۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۸۶) ابن خرداذبہ،المسالك والممالك، بریل لیدن، ۱۸۸۹ء، ص۸۴۔۸۳

(۸۷) السیوطی، جلال الدین، حسن المحاضرہ فی اخبار مصر و القاھرہ ، ج۱،ص۱۷

(۸۸) ابن تغری بردی، جمال الدین،النجوم الزاھرہ فی ملوك المصر و القاھرہ، ج۱،ص۳۶۰

(۸۹) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف، کتاب الولاۃ و القضاۃ،ص۱۰۱

(۹۰) ایضاً،ص۹۸

(۹۱) ایضاً،ص۱۱۵۔۱۱۱

(۹۲) ابن تغری بردی، جمال الدین،النجوم الزاھرہ فی ملوك المصر و القاھرہ، ج۱،ص۴۳۷

(۹۳) المقریزی، تقی الدین احمد بن علی، کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار، ج۱،ص۸۰

(۹۴) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف، کتاب الولاۃ و القضاۃ،ص۱۴۳

(95) Grohmann,Adolf: Allgemein Einfuhrung in die arabichen Papyri,P:49

لیکن التوفی کے مطابق کیدر کو بھی معتصم ہی نے مقرر کیا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: التوفی، محمد بن عبدالمعطی بن ابی الفتح بن احمد، کتاب اخبار الاول، المطبعۃ المنیریۃ، مصر، ۱۳۱۰ھ، ص۱۰۵

(۹۶) المقریزی، تقی الدین احمد بن علی، کتاب المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط والآثار، ج۱،ص۹۴

(۹۷) الکندی، ابوعمر محمد بن یوسف، کتاب الولاۃ و القضاۃ،ص۱۹۴

(۹۸) جس طرح عنبسہ مصر کا آخری عرب والی تھا اسی طرح ۲۴۷ھ میں احمد بن محمد المدبر آخری عرب صاحب الخراج مقرر ہوا تھا۔ ۲۵۴ھ میں جب احمد بن طولون مصر کا والی مقرر ہوا تو احمد بن المدبر وہاں موجود تھا۔ مصر کی تاریخ میں اس کی شخصیت اس قدر اہم ہے کہ الگ مضمون کی متقاضی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فروغِ عربی زبان وادب
(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کاوشوں کا جائزہ)

محمد سرفراز خالد*

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۳ء۔۱۹۹۹ء) کا شمار برصغیر پاک و ہند کے نامور علماء دین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی دینی علوم کی درس و تدریس اور عربی زبان کی ترویج و اشاعت میں صرف کی۔ عرب وعجم میں ان کی خدمات کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ عرب نے جب عربی زبان وادب کے نامور افراد پر مشتمل ایک مؤثر تنظیم ''رابطہ ادب اسلامی'' کی تشکیل کا ارادہ کیا تو اس تنظیم کی سربراہی کے لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے گذارش کی گئی۔ انہوں نے اس پیشکش کو قبول فرمایا اور تاحیات اس کے صدر نشیں رہے۔

عربی ماحول میں پرورش:

سید ابوالحسن علی ندوی کی ولادت لکھنؤ شہر میں نامور ادبی وعلمی شخصیت حکیم مولانا سید عبدالحی لکھنویؒ کے ہاں ہوئی، جن کا اکثر وقت مطب میں علاج معالجہ کے علاوہ ندوۃ العلماء کی نظامت کے کاموں میں صرف ہوتا۔ جہاں انہیں تحریر وتصنیف کے مواقع بھی میسر آجاتے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ عمان میں منعقدہ ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے موقع پر اپنے خطاب بعنوان ''ہندوستان میں مسلمان اوران کا تاریخی کردار'' میں دیگر اکابرین برصغیر پاک و ہند کی مساعیٔ جمیلہ کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے والدگرامی کی خدمات کے اعتراف میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ہندوستان کی مختلف پہلوں سے اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی عربی تصانیف کا ذکر کیا۔ جن میں سے ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون کی تاریخ اور علمائے ہند کی تصنیفات کی ڈائرکٹری ''الثقافة الاسلاميه فی الهند'' کے نام سے دمشق کی مشہور وموقر سرکاری اکیڈیمی ''المجمع العلمی العربی'' (حال: مجمع اللغۃ العربیۃ) کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔'' (۱)

آپ کی والدہ سیدہ خیر النساء، حفظ القرآن کی دولت سے فیضیاب ہونے کے ساتھ ساتھ شعرونثر کی کئی کتابوں کی مصنفہ تھیں۔ علاوہ ازیں ان کے گھرانے کے دیگر بہت سے افراد تصنیف وتالیف میں شہرت رکھتے تھے۔ اس علمی ماحول میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے پرورش پائی۔ مذہبی گھرانہ ہونے کی وجہ سے قرآن وسنت کی

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی وعلومِ اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی لاہور، پاکستان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تدریس اور عربی زبان کی تعلیم پر بھرپور توجہ دی جاتی تھی۔حسب روایت مولانا کی تعلیم و تربیت میں بھی اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔خوش قسمتی سے انہیں بچپن میں ہی ایک عرب استاذ شیخ محمد بن خلیل سے عربی سیکھنے کا موقع میسر آیا جس کا اظہار مولانا ابوالحسن ندویؒ نے اِن الفاظ میں کیا ہے:

''بھائی صاحب نے جب عرب صاحب سے مجھے عربی شروع کرانے کو کہا تو انہوں نے ایک دن کاپی پر ماضی کی گردان ''فَعَلَ ،فَعَلَا ،فَعَلُوا'' لکھ کر دی اور کہا کہ یاد کر کے لے آؤ۔اس کے چند دن بعد ہی انہوں نے اپنی محبوب نصابی کتاب ''المطالعة العربية'' شروع کرا دی، اس وقت عرب صاحب بازار جھاؤ لال کی اسی گلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے،اور لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے۔''(۲)

عرب استاد نے انہیں عربی لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ بول چال کی طرف بھی خصوصی توجہ دلائی، جس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے بہت جلد عربی بول چال میں مہارت حاصل کر لی۔مولانا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''چند ہی دن بعد انہوں نے عربی میں بولنا لازم کر دیا۔اُردو بولنے پر دو پیسے یا ایک آنہ کا جرمانہ ہوتا تھا، جو ہم لوگوں کو اکثر ادا کرنا پڑا۔''(۳)

اسلامی ماحول اور تربیت کے ساتھ ساتھ تحریر و تقریر کا ذوق اور ترغیب بھی انہیں وراثت میں ملی ہوئی تھی لہٰذا بہت جلد علمی کتب تحریر کرنا شروع کر دیں۔مولانا اپنی کتاب ''نبیٔ رحمت'' کے پیش لفظ میں اپنی اس کتاب کی تحریر مکمل ہونے پر اظہارِ تشکر کرتے ہوئے اس بہترین کاوش کو خاندانی تربیت کا ثمر قرار دیتے ہیں:

''اس میں سب سے بڑا حصہ اس (مصنف) کے برادر اکبر ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحبؒ کی حکیمانہ تربیت اور راہنمائی کا ہے۔اس کا فائدہ تھا کہ اس نے بہت کم سنی اور نوعمری میں اُردو کی وہ بہترین کتابیں پڑھ لیں جس میں عربی زبان کے بعد سیرت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور عہد آخر میں اس پر بڑا کام ہوا ہے۔جب عربی زبان و ادب کا کچھ ذوق پیدا ہوا تو اس نے اپنی ساری توجہ سیرت کے عربی مآخذ پر مرکوز کر دی۔''(۴)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریروں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان تحریروں میں وسعت اور بالغ نظری کے پیچھے ان کے خاندان کے تعلیم یافتہ افراد کی جدوجہد،عربی زبان میں اظہار خیال اور ندوۃ العلماء کی علمی اور انتظامی ذمہ داریوں کا بھرپور حصہ ہے جس سے ان کی تحریروں میں نکھار پیدا ہو گیا ہے۔مولانا اپنے ذوق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس تصنیفی ذوق کا، جو کہ کم از کم تین پشتوں سے موروثی چلا آ رہا ہے تھا، خاندانی افتادِ طبیعت جو ہنگاموں اور سیاسی کاموں سے مناسبت نہیں رکھتی تھی، پھر عالم عربی کے حالات سے قلبی و ذہنی وابستگی اوراس کی وجہ سے عربی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنانے، اس پر مستزاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیمی وتربیتی ذمہ داری ...... نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔'' (۵)

ندوۃ العلماء میں عربی تدریس کی ذمہ داری:

ندوۃ العلماء لکھنوء نے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی عربی زبان وادب پر دسترس کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں تفسیر وادب مقرر کیا اوران کے ذمہ تفسیر القرآن کی نامورعربی کتب لگائی گئیں۔ مولانا اپنی تدریسی ذمہ داریوں کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''۱۹۳۴ء میں ہیچمدان کا تقرر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ تفسیر وادب کی حیثیت سے ہوا اور انہی دونوں مضامین کے اسباق اس کے سپرد ہوئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر کی قدیم ومستند کتابیں (جلالین، بیضاوی اور کشاف) داخل نصاب تھیں۔''(۶)

مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ادبی خدمات کوخراج تحسین پیش کرتے ہوئے مولانا کے ذمہ عربی ادب کی کتب کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جن کی تدریس مولانا ابوالحسن علی ندوی کی عربی زبان وادب میں مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چنانچہ مولانا اسجد قاسمی اُن کی عربی زبان وادب میں مہارت نامہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

۱۹۳۴ء میں جب مولانا ندوۃ العلماء کے استاذ منتخب ہوئے تو عربی ادب کی بعض کتابیں آپ سے متعلق رہیں جن میں دیوان حماسہ، القرأة الرشید، حکایات الاطفال وغیرہ شامل ہیں، اسوقت ندوہ کی پوری فضاء پر عربی زبان وادب، انشاء وخطابت چھائی ہوئی تھی۔ مشہور ادیب مولانا مسعود عالم ندوی کی رفاقت میں مولانا کی ادبی وعلمی سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں، عربی زبان کی تعلیم میں خلیل عرب کی طرح گھول کر پلا دینے اور ہر طرح سے مشق کرانے کا اہتمام مولانا نے خوب خوب کیا۔(۷)

عربی زبان سے صحیح معنوں میں شناسائی کے لیے قرآن کریم کے متن کوعربی تفاسیر کی روشنی میں پڑھنا ازحد ضروری ہے۔ اس سے نہ صرف دین اسلام کی تفہیم بہترین انداز میں ہوسکتی ہے بلکہ عربی زبان وادب سے بھی واقفیت حاصل ہوسکتی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء استاذ کے نصاب میں بات اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

> ''دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے برصغیر کے مدارس میں پہلی مرتبہ قرآن کریم کا نص (متن) (سلف کی تفسیروں کی روشنی میں) نصاب میں داخل کیا۔قرآن کریم اورادب عربی یہی دو بنیادی عناصر ہیں جن سے دعوت وتبلیغ کا ذہن تیار ہوسکتا ہے اوراس کی صلاحیت و قدرت پیدا ہوسکتی ہے اور جب تک کہ قرآن کریم سے شغف نہ ہو اور وہ ایک زندہ کتاب کی طرح نہ پڑھا جائے اورعربی زبان کا صحیح مذاق حاصل نہ ہواس وقت تک دین کی صحیح فکر اس کے اولین ماخذ سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔''(۸)

عربی زبان وادب کے فروغ میں جہاں کتب تفسیر کی تدریس کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی خصوصی توجہ سے طلبہ میں تحریر تقریر اور دعوت وتبلیغ وغیرہ کے اوصاف پیدا کرنے کے لیے بھی عربی زبان کو ذریعہ اظہار رائے بنایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلماء کو برصغیر پاک وہند کی درس گاہوں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوا۔

> ''دارالعلوم ندوۃ العلماء نے عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھانے کا نظم کیا جو صرف کتابوں میں محدود نہیں ہے بلکہ وہ تقریر وتحریر، علم وادب، تبلیغ و دعوت اور سیاست وصحافت کی بھی زبان ہے۔ برصغیر کی درسگاہوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے ندوہ کو اس خصوصی توفیق سے نوازا جس کا محرک سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہ عربی زبان ودعوت دین کا اولین ذریعہ ہے۔''(۹)

اصلاح نصاب کی کوششیں:

مولانا کا تعلق چونکہ ندوۃ العلماء لکھنوء سے تھا لہٰذا وہ اس کی اصلاح و بہتری کے لیے ہر ممکن کوشاں رہتے۔ علاوہ ازیں مدرسہ میں پڑھائے جانے والے نصاب میں عربی زبان کی ضرورت اور اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے تاکہ ندوہ میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اس کے ذریعے اپنے اندر بہترین تحریر وتقریر کی استعداد پیدا کرسکیں۔ ندوہ العلماء کے منتظمین کے اغراض مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ بیان کرتے ہیں کہ یہاں عربی زبان کی تدریس کو خاص اہمیت دی جاتی ہے:

> ''ندوۃ العلماء'' کے بانیوں اور منتظمین نے ہمیشہ نصاب کو ''وسیلہ'' سمجھا غایت نہیں۔ غایت اور مقصد میں ترمیم نہیں ہوتی لیکن وسیلہ میں ترمیم ہوتی ہے۔ درس نظامی میں بھی برابر ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ پھر بتایا گیا کہ اس وقت عربی زبان کی تدریس ایک زندہ عملی زبان کی حیثیت سے بہت ضروری ہے۔''(۱۰)

ندوۃ العلماء لکھنوء کے قیام کے بنیادی مقاصد میں ان امور کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا کہ طلبہ درسی کتب کی درس و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تدریس کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں تحریر وتقریر میں مہارت و ملکہ حاصل کریں اور ان کے ذریعے عرب ممالک میں بھی اپنا پیغام پہنچانے کی صلاحیت حاصل کریں۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ایسے اقدامات اٹھانے پر ندوۃ العلماء کے بانیوں کی دور اندیشی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پہلے عربی زبان کی کل قیمت اور اہمیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ قدیم درسی کتابوں کے سمجھنے کا ایک ذریعہ اور پل ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بنیادی بات ہے اور اس کا اصل فائدہ اور مقصد ہے۔ لیکن ندوۃ العلماء کے قیام سے پہلے کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ دعوتی مقاصد کے لیے بھی عربی زبان کو حاصل کرنا چاہیے۔ اس کو ذریعہ بنا کر عربوں کو دعوت دی جا سکتی ہے اور انہیں ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جا سکتا ہے۔ وہ عرب جن سے ہمیں ایمان جیسی لازوال دولت ملی۔''(۱۱)

اصلاح نصاب اور کتب ندوی:

ندوۃ العلماء کے نصاب کو جدید تقاضوں سے ہمکنار کرنے کا جذبہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے دل و دماغ میں موجزن تھا۔ اس خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے انہوں نے نوجوانی میں ہی ایک عظیم الشان کتاب مرتب فرمائی۔ مولانا اسجد قاسمی ندوی اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کے دل میں نئے نصاب کی ترتیب کا داعیہ بڑی تیزی سے پیدا ہوا، اس کام کا آغاز ''مختارات من ادب العرب'' کی ترتیب سے ہوا جو قرن اول سے لے کر عصر حاضر تک کے عربی نثر وادب کے اعلیٰ نمونوں پر مشتمل ہونے کے ساتھ سجع و قافیہ اور تصنع اور تکلف سے آزاد اور صالح مقاصد اور صحت مند خیالات کی آئینہ دار بھی ثابت ہوئی۔ یہ کتاب ۱۹۴۰ء میں مکمل ہوئی اور ۱۹۴۲ء میں پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی اور دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ میں عربی ادب کے نصاب میں داخل کی گئی۔''(۱۲)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی مرتبہ عربی ادب و نثر کی اس شاہکار کتاب کو بہت کم عرصہ میں بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی اور ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے اسے دادِ تحسین پیش کیا۔ مختلف تدریسی اداروں نے اسے شاملِ نصاب کرنا اپنے لیے اعزاز سمجھا۔

''مختارات زیادہ تر جدید حلقوں اور یونیورسٹیوں کے ایم اے عربی کے کورس میں داخل ہوئی جن میں علی گڑھ، الہ آباد، حیدرآباد، مدراس، دہلی اور لکھنؤ کی یونیورسٹیاں نمایاں ہیں، سعودی عرب کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وزارت تعلیم نے بھی اس کو اپنے یہاں کے نصاب میں داخل کیا، پاکستان و بنگلہ دیش، عرب ممالک اور بعض مغربی ممالک میں بھی یہ داخل درس ہوئی۔''(۱۳)

عربی ادب کے شاہکار نمونوں پر مشتمل نادر کتاب ''**مختارات من ادب العرب**'' مولانا ندویؒ کی ایک بے مثال کوشش تھی۔ ایک ماہر نفسیات کی طرح انہوں نے اس کتاب میں مختلف انواع و اقسام کی تحریروں کو جمع کیا تا کہ طلباء میں دلچسپی کا سامان پیدا ہو سکے۔ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، اس کتاب کے مؤلف مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

> ''مؤلف نے سب سے پہلے مختارات کا مجموعہ تیار کیا، جو اسلامی عربی ادب کے نمونے اپنے تمام مظاہر اور پہلے اسلامی دور سے لے کر چودہویں صدی ہجری تک مختلف ادبی، تاریخی، اور تہذیبی شکلوں میں پیش کرتا ہے، اس میں عربی ادب کے مختلف رنگ و آہنگ بھی ہیں، آسمانی وحی اور نبوی بلاغت کے شاہکار بھی ہیں، عربی کے سب سے ترقی یافتہ دور کے مشاہیر عرب خطباء کے خطبات کے نمونے بھی ہیں، روایات، قصص اور رسائل بھی ہیں، کتابیں، مناقشے، محاورات، اسفار اور عام گھریلو باتیں بھی ہیں، متانت سنجیدگی، حکمت و دانائی بھی، اور مزاحیہ ادب کے نمونے اور تفریحی چیزیں بھی ہیں۔''(۱۴)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے عربی زبان و ادب کے شاہ پاروں میں سے انتخاب کر کے ایک دوسری کتاب ''**القراۃ الراشدۃ**'' بھی مرتب کی جو تین حصوں پر مشتمل تھی۔ اسے بھی خاص و عام میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ خود مولانا اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں:

> ''کتاب میں اس کا التزام ہے کہ حتی الامکان کوئی سبق دینی موعظت سے خالی نہ ہو اور آخر میں اس کا کوئی اخلاقی و دینی نتیجہ نکلتا ہو یا کسی دینی تعلیم یا آداب کی طرف رہبری ہوتی ہو، لیکن اس طرح کہ طالب علم کو محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے یا باہر سے لائی جاری ہے، یا اس کو کوئی خارجی انجکشن دیا جا رہا ہے۔''(۱۵)

ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی کتاب کی وجہ تالیف فروغ عربی زبان و ادب کو قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''عربی زبان جس کا سرچشمہ کتاب و سنت ہے اس کا نصاب دین کے بنیادی فکر سے عاری تھا۔ خاص طور پر زبان کی ابتدائی تعلیم جو فرد کی زندگی میں پتھر کی لکیر ثابت ہوتی ہے اور عربی زبان کی تعلیم جو مسلم معاشرہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے نصاب تعلیم پر القراۃ الراشد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الجز الاول کے مقدمہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور انہوں نے تحریر کیا کہ جو نصاب تعلیم عام طور پر رائج ہے اس میں اسلامی ثقافت وتہذیب اور سلف صالحین کی کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ غلط تصویر کشی ہے اور بچوں کے ذہن ودماغ کے ساتھ ایک مذاق ہے۔"(۱۶)

ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی اس کتاب کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"بچوں کے ادب میں ایک خلا تھا کیونکہ بچہ کی ادبی اور لغوی تربیت میں دین کا حصہ بہت کم تھا حالانکہ عربی زبان ہی دین کی زبان ہے۔لیکن وہ دینی تعلیمات سے الگ تھلگ تھی، اور دنیاوی معاملات اور تمدنی معلومات سے الگ رہ گئی تھی۔ اس بدنما عیب اور معیوب نقص کو اس سلسلہ کے مؤلف نے"القراۃ الراشدہ" کا سلسلہ شروع کیا، اور اس کتاب کے تین حصوں میں اس سلسلہ کو مکمل کیا اور ہر حصہ اپنے لغوی اور ادبی میعار میں بچوں کی ادبی ترقی اور ان کی مذہبی ثقافت میں وسعت کو دیکھتے ہوئے پہلے سے فائق ہے۔"(۱۷)

جس کتاب نے عربی زبان وادب میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی وہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی مرتبہ کتاب **قصص النبیین** ہے۔ یہ کتاب کامل کیلانی کی مرتبہ کتاب **حکایات الاطفال** کا بہترین نعم البدل ثابت ہوئی جس میں بہت سی فضول تصویریں اور لغو قصوں کی بھرمار تھی جس کی وجہ سے بچوں میں اخلاقی بگاڑ کا خدشہ پایا جاتا تھا۔ لہٰذا مولانا نے بچوں کی اخلاقی تربیت کو پیشِ نظر رکھ کر انبیاء کرام کے حالات و واقعات پر مشتمل اس کتاب کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا۔"اس کتاب میں مولانا نے چند امور کا التزام کیا ہے۔

☆ ایک تو یہ کہ الفاظ کا ذخیرہ کم سے کم ہو، لیکن اعادہ وتکرار سے اسے ذہن میں نقش کر دیا جائے۔

☆ دوسرے یہ کہ کتاب قرآن کی زبان میں لکھی جائے اور آیاتِ قرآنی جگہ جگہ نگینہ کی طرح جڑ دی جائیں۔

☆ تیسری یہ کہ اسلام کے بنیادی عقائد (توحید، رسالت اور معاد) کی تلقین وتعلیم ضمناً ہوجائے۔

☆ چوتھے یہ کہ قصوں کو پھیلا کر لکھا جائے اور ان میں ایسی رہنمائی کا سامان ہو کہ بچوں کے دلوں میں کفر وشرک کی نفرت، ایمان وتوحید کی محبت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت راسخ ہوجائے اور یہ سب غیر شعوری طریقہ پر ہو۔"

"**قصص النبیین**" نے بھی اہل علم کے ہاں خصوصی مقبولیت حاصل کی۔ برصغیر پاک وہند کی بہت سی یونیورسٹیوں نے اسے ایم۔اے عربی کے نصاب میں شامل کیا ہے۔ پانچ حصوں پر مشتمل یہ کتاب طلبہ اور بچوں کے ادب میں بے مثال کتاب تصور کی جاتی ہے اور یہ کتاب مولانا کی مشہور کتاب السیرۃ النبویہ (نبی رحمت) تحریر کرنے کی محرک ثابت ہوئی۔"(۱۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی اپنے مقالہ ''حضرت مولانا علی میاں کی ادبی خدمات اور تصانیف'' میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک اور کتاب کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''قصص النبیین کے سلسلہ کے علاوہ مولانا کی ایک کتاب ''قصص من التاریخ الاسلامی'' بھی ادب الأطفال کے سلسلہ کی چیز ہے، ادب الأطفال (Children's Literature) کے علاوہ ادب نبوی کو واضح کرکے پیش کرنے میں مولانا کا اہم رول رہا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی ان احادیث کو مولانا نے منتخب کرکے اپنی کتابوں میں جمع کردیا ہے جن میں صدق و اخلاص، جمال و بلاغت شرینی و چاشنی، ساتھ ہی پیغمبرانہ بلاغت واعجاز کے عناصر پوری طرح ملتے ہیں، مولانا نے انتخاب میں صحت سند کا بڑا اہتمام کیا ہے، یہ احادیث ادب عربی کا سب سے کامیاب نمونہ ہیں۔''(۱۹)

مدارس اسلامیہ میں نصاب کی اصلاح ہمیشہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے پیش نظر رہی۔ قبل ازیں عربی ادب مدارس اسلامیہ میں مروج نہ تھا مگر مولانا کی دور بین نگاہوں نے محسوس کرلیا کہ عربی ادب طلباء کی ذہنی نشو ونما کے لیے ازحد ضروری ہے۔ عارف جنید، مولاناؒ کی اس معاملہ فہمی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مولاناؒ ندوہ میں ادب وتفسیر کے استاذ ہوئے، اور آپ نے اپنی فراست اور گہرے مطالعہ سے جلدی ہی اندازہ لگا لیا کہ طلبہ کی ذہنی تعمیر اور فکری اصلاح میں ادب طاقتور وسیلہ بن گیا ہے، پس پھر کیا تھا، آپ نے اپنے رفقاء کی مدد سے ادب عربی کا بالکل نیا نصاب تیار کرڈالا، جس میں بقول مولانا مسعود عالم ندوی ''زبان اور دین کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کردیا ہے جیسے گوشت اور ناخن۔

قصص النبیین، القرأة الراشده اور **مختارات** آپ کی وہ درسی کتابیں ہیں، جو تقریباً ہندوستان کے ہر دینی مدرسہ میں داخل نصاب ہیں، اور عصری درسگاہوں میں بھی ان کو خاصی اہمیت حاصل ہے، مولانا کی دوسری عربی تصنیفات بھی اہم دینی مدارس میں طلبہ کے مطالعہ کے لئے تجویز کی جاتی ہیں۔''(۲۰)

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف کردہ کتب میں ان کے اسلوب نگارش کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال حسین ندوی لکھتے ہیں:

> مولانا نے ہندوستان کے مدارس میں تعلیم پانے والے طلبہ کو مدنظر رکھ کر بچوں کے لیے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ہندوستان کے طلبہ عربی زبان عام طور پر نو دس سال کی عمر میں پڑھنا شروع کرتے ہیں جو بچپن اور مراہق کے درمیان کی عمر ہوتی ہے۔ مولانا نے عمر کے لحاظ سے نفسیات کا پورا خیال رکھا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور بچوں کی ذہنی استعداد کی رعایت کرتے ہوئے مضامین، مواد اور طرز کو اپنایا ہے۔(۲۱)

چونکہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی تعلیم وتربیت میں عرب اساتذہ اور خاندانی مذہبی اور علمی رجحان نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا تھا لہٰذا آپ کی تحریر میں وہ جاذبیت اور اثر آفرینی پائی جاتی تھی جو ان کے معاصرین کے ہاں بہت کم پائی جاتی ہے۔ قاری اس کی تحریر کے سحر میں مبتلا ہوجاتا اور تادیر مطالعہ میں مصروف رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے جلد ہی شہرت چہار دانگ عالم حاصل کرلی۔

''مولانا کی عربی وادبی عبارتوں میں بے پناہ جاذبیت اور سحر ہے۔ یہ امتیاز انھیں بلند پایہ افراد کو میسر آتا ہے جو بات کی تہہ اور حقیقت تک پہنچ جائیں۔ یہ قرآن کے شغف و برکت کا نتیجہ ہے۔ مولانا کی کوئی تقریر قرآن وسنت کے حوالوں سے خالی نہیں ہے بلکہ اس میں ایسی حلاوت وتاثیر ہوتی ہے جو معاصرین کے یہاں ناپید ہے۔ ساری تالیفات میں یہی جوش وجذبہ کارفرما ہے کہ اسی لئے پڑھنے والا مولانا کے پاکیزہ احساسات، دل کی دردمندی، عقل کی بلندی اور فکر کی سلامتی کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔''(۲۲)

فروغ عربی زبان وادب میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ اُن کے پیش نظر طلباء اور نوجوان نسل کی دراصل صراط مستقیم کی طرف راہنمائی تھی۔ عربی زبان وادب پر مہارت کی وجہ سے اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے قصص الانبیاء کو ایک اچھوتے انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اسلوب تحریر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''آپ نے عربی زبان کے اپنے ممتاز ومخصوص اسلوب کے ذریعہ بچوں کے ادب کو مالا مال کیا، اور مسلمان نسل کو قرآن کریم کی روشنی اور مستند اسلامی تاریخ کے آئینہ میں انبیاء کرام کے قصوں اور رسولوں کی حکایت سے صحت بخش غذا بہم پہنچائی۔ آپ نے آسان اور خوبصورت عربی زبان اور پختہ ادبی اسلوب میں انبیاء کرام کے قصوں اور ان کی حکایات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جس میں بچوں کی ابتدائی، درمیانی اور اخیر زندگی کے مختلف مراحل میں ان کی ذہنی سطح اور ان کے تقاضوں اور ضروریات کی مکمل رعایت کی۔''(۲۳)

عربی زبان وادب میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی مہارت قابل رشک تھی۔ برصغیر پاک وہند میں نہ صرف اپنی مثال آپ سمجھے جاتے تھے بلکہ عرب ممالک میں بھی آپ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ اکثر اوقات عرب ممالک میں آپ کو مدعو کیا جاتا اور آپ کے افکار سے استفادہ کیا جاتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو پوری امت مسلمہ اور عالم انسانیت کے لئے ایک فکرمند دل دے کر پیدا کیا تھا اور زبان بھی ایسی فصیح و بلیغ عطا فرمائی تھی کہ سامع اور قاری ان کی فصاحت و لطافت میں کھو جاتے تھے۔ عربی زبان و بیان پر ان کی قدرت و مہارت کا یہ عالم تھا کہ اہل عرب بھی اس پر رشک کرتے تھے، حالانکہ اہل زبان بہت کم کسی غیر زبان کی زبان دانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا اس عہد کے غالباً واحد عجمی تھے جن کے زبان دانی کو عرب بھی رشک بھری نظروں سے دیکھتے اور سحر زدہ ہو کر سنتے تھے۔''(۲۴)

عربی زبان و ادب میں ایک نمایاں مقام پر فائز ہونے کے باوجود ان میں غرور اور تکبر نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ دوران درس و تدریس طلباء کو بڑی جانفشانی سے عربی ادب کی نکتہ آفرینیوں سے آگاہ فرماتے۔ بلکہ اکثر اوقات کوئی نقطہ یا تعبیر بیان کرتے وقت کبھی یہ بتاتے ہوئے عار محسوس نہ کرتے کہ یہ بات انہوں نے کس شخص یا کتاب سے حاصل کی ہے۔

''ادب عربی میں اپنا خاص مقام رکھنے اور فن کی باریکیوں میں مہارت کے باوجود ایک دفعہ مولانا نے بلاتردد طلبہ کے سامنے بیان کر دیا کہ کسی بات پر زور دینے کے لئے عربی میں کیا تعبیر اختیار کی جاتی ہے، اس کو انھوں نے ایک عربی عالم کے زبان سے ایک کانفرنس کی ذیلی کمیٹی کے دوران اخذ کیا، اور پھر آپ نے پورا قصہ سنایا، الارکان الاربعۃ کے درس کے دوران جب کوئی نادر تعبیر آتی تو آپ اس کی خوبیوں کو مزے لے لے کر بیان کرتے اور فرماتے کہ آپ نے یہ تعبیر کہاں سے لی ہے۔''(۲۵)

مدارس عربیہ کی اصلاح اور مولانا ندویؒ:

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عربی زبان ایک فصیح و بلیغ زبان ہے جس میں درس و تدریس کے علاوہ ہر طرح سے علمی و ادبی گفتگو کرنے کی اہلیت موجود ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے دینی و تبلیغی اداروں اور اہل علم حضرات کو عربی زبان و ادب کے فروغ میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے کیونکہ دنیا کے دیگر ممالک کے علاوہ عرب ممالک میں اپنے فکری پیغام کی نشر و اشاعت کے لیے عربی زبان ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مدارس عربیہ کے منتظمین اور مبلغین اسلام کے لیے اس کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے مدارس میں جس انداز پر عربی زبان و ادب کی تعلیم ہو رہی ہے اس کے ساتھ ان ملکوں میں کوئی علمی خدمت یا دعوتی کام ناممکن ہے، اگر آپ کو عرب دُنیا میں دین کی دعوت و تبلیغ کا کام انجام دینا ہے یا ہندوستان کی دینی و علمی تحریکات کا تعارف کرانا ہے تو اس کے لیے بڑے پیمانے پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تیاری کی ضرورت ہوگی۔ اب ہندوستان ان ملکوں سے الگ نہیں رہ سکتا، دُنیا کی سیاست میں شرق اوسط کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ اہمیت بڑھتی جائے گی۔''(۲۶)

علماء وفضلاء کا یہ دینی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ نوجوان نسل کی درست سمت کی طرف راہنمائی کریں اور انہیں اہل عرب اور عربی زبان کی عظمت سے روشناس کرایا جائے تا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اُبھار کر سامنے لاسکیں اور ملک وملت کا نام روشن کریں۔ مگر مولانا ابوالحسن ندویؒ کے خیال میں علماء اپنے اس فریضہ سے غافل نظر آتے ہیں۔ اساتذہ اور اہل قلم کو اپنے اس فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ایک طرف اس کی ضرورت تھی کہ عربی ادب کے خزانۂ عامرہ سے وہ طاقت ور اور دل آویز ادبی وتحریری نمونے نکالے جائیں اور ان کو نمایاں کیا جائے، جن کو سہولت پسندی اور قدیم مؤرخین ادب کی پیروی میں نظر انداز کر دیا گیا۔ یا اس قصور میں کہ وہ کسی عالم و داعی اور دینی شخصیت کے قلم سے نکلے ہیں، ان کو ''ایوان ادب'' سے دور کر دینے یا الگ رکھنے کی سزا دی گئی، اور صدیوں ان پر پردہ پڑا رہا۔ دوسری ضرورت اس کی تھی کہ ادب عربی کے ایسے اساتذہ، اہلِ قلم اور دانشوروں کو جمع کیا جائے جو عربی ادب و انشاء اور تنقید و تاریخ ادب کو صحیح رُخ پر لگانے کی کوشش کریں، اور جدید نسل کو صالح غذا پہنچانے کے لیے ایک نیا ذخیرہ کتب (مکتبہ) اور ایک نیا مدرسۂ فکر (مکتبہ خیال) پیدا کرسکیں۔(۲۷)

ایک مسلمان کا اپنے آقا و مولیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ ایک قلبی و روحانی تعلق، اس مسلمان کے ایمان کی مضبوطی کی علامت ہے۔ نبی محترم ﷺ کے سرچشمۂ فیضان سے سیراب ہوکر ایمان مزید مستحکم ہوتا ہے۔ مدارس عربیہ جہاں عربی زبان فہمی اور قرآن وسنت کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے، وہ بھی اس سرچشمہ سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مدرسہ کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے واضح کرتے ہیں:

''میں مدرسہ کو ہر مرکز سے بڑھ کر مستحکم، طاقت ور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا اور حرکت ونمو سے لبریز سمجھتا ہوں۔ اس کا اک سرا نبوت محمدیؐ سے ملا ہوا ہے، دوسرا سِرا اس زندگی سے۔ وہ نبوت محمدیؐ کے چشمۂ حیوان سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے۔ نہ نبوتِ محمدی ﷺ کا دریا پایاب ہونے والا ہے۔ نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے، نہ نبوت محمدی کے چشمۂ فیض سے بُخل وانکار ہے، نہ انسانیت کے کاسۂ گدائی کی طرف سے استغناء کا اظہار، ادھر سے انما انا قاسم و اللّٰہ یعطی کی صدائے مکرر ہے، تو ادھر سے ھل من مزید، ھل من مزید کی فغان مسلسل، مدرسہ سے بڑھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دُنیا میں کون سا زندہ، متحرک اور مصروف ادارہ ہوسکتا ہے۔''(۲۸)

یقیناً مدارسِ عربیہ، عربی زبان کی اشاعت و ترویج میں بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں جن میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ ایسے ادارے ہیں جہاں قرآن و حدیث اور دیگر علوم کی تدریس کا اہتمام عربی زبان میں ہوتا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مدرسہ میں صرف عربی زبان کی درس و تدریس ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ندوۃ کی تقلید میں طلبہ کی کردار سازی کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے اور طلبہ کی اس طرح تعلیم و تربیت کا بندوبست ہو کہ ان کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق مضبوط ہونا چاہیے:

''میں کسی بھی مدرسہ کی یہ تعریف ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ جہاں ایسی زبان سکھائی جاتی ہے جس کی بدولت عربی کتابیں پڑھی جاسکیں اور اس سے دُنیاوی فائدے اُٹھائے جاسکیں۔ عربی مدرسہ کی ہرگز یہ تعریف نہیں، بلکہ وہ تو وہ جگہ ہے جہاں طالب علم کے درمیان، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اور خدا کے درمیان ایک بلاواسطہ کڑی ہے، جس کا ایک سرا ادھر ہے اور دوسرا اللہ کے قبضہ میں ہے۔''(۲۹)

مولانا ندویؒ کی تحریروں میں یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں عربی زبان اور اسلامیات کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ متفکر رہتے تھے اور اربابِ علم و دانش کو اس المیہ پر نہ صرف توجہ دلاتے، بلکہ اس کے تدارک کے لیے عملی اقدامات اُٹھانے کی بھی ترغیب دیتے۔ تاکہ ارباب اختیار اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہوں اور پھر عربی زبان کی تدریس و اشاعت پر بھی مائل ہوں اور اس کے ذریعے طلبہ کو دین اسلام کی تفہیم اور عربی زبان و ادب کی درس و تدریس کا اہتمام ہوسکے:

''سیاسیات و معاشیات اور تاریخ و ادب سے الحاد و تشکیک کا کام لیا جا رہا ہے، علومِ عمرانیہ (سوشیالوجی) اور انگریزی ادب کے ذریعہ مذہب بیزاری اور ذہنی انتشار پیدا کیا جاتا ہے۔ آپ کے لیے شاید ایک حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ آج بہت سی یونیورسٹیوں کے عربی و اُردو کے شعبے الحاد و تشکیک کے مرکز بنے ہوئے ہیں اور شاید بعض یونیورسٹیوں میں عربی، مطالعہ اسلامیات دینی حیثیت سے سب سے کمزور ہے۔ ہم کو اس صورتِ حال کا وسیع النظری، وسیع القلبی اور حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہم کو زندگی کے میدان میں اُترنے اور اسلامی دعوت اور شریعت اسلامی کی حفاظت کا مقدس فریضہ اپنے ذمہ لینے سے پہلے کیا تیاریاں کرنی چاہیے اور کن جدید اسلحہ سے مسلح اور کن جدید طریقہ ہائے جنگ سے واقف اور ماہر ہونا چاہیے۔''(۳۰)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عربی زبان وادب کی اہمیت اور مولانا ندویؒ:

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عربی زبان وادب کے فروغ کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ اپنی تحریر وتقریر میں طلبہ اور اہل علم حضرات کو عربی زبان کی ضرورت واہمیت کا احساس دلاتے رہے۔ عربی کے اساتذہ اور علماء کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ ان کی تحریروں میں اکثر اس کا بھرپور اظہار نظر آتا ہے۔ برصغیر پاک وہند میں عربی زبان وادب میں مہارت رکھنے والوں کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہر دور میں یہاں عربی زبان سے دلچسپی رکھنے، اس کے سمجھنے اور اس میں تحقیقی تصنیف کرنے والے موجود رہے۔ یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ یہاں کے فضلاء اس ملک میں رہتے ہوئے عربی زبان پر عبور اور پوری طرح دسترس رکھتے ہیں۔''(۳۱)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ آپ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر تھے۔ ان کی کوششوں سے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اس کی ایک شاخ قائم کی گئی۔ جہاں فروغِ عربی زبان وادب کی بھرپور کوششیں ہوتی رہیں۔

> ''رابطۂ ادب اسلامی کے پلیٹ فارم ادب اسلامی کا پیغام عام کرنے کے لیے سیمیناروں کے علاوہ متعدد کتابیں، اردو عربی رسائل بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن میں حضرت مولانا کی کتاب ''نظرات فی الادب'' اور متعدد چھوٹے رسائل سرفہرست ہیں۔ عربی اردو کے دو مجلّات (الأدب الاسلامی، کاروان ادب) ندوۃ العلماء سے بھی شائع ہوتے ہیں۔''(۳۲)

عربی زبان کو جو مقام ومرتبہ حاصل ہے کسی اور زبان کے حصہ میں نہیں آیا۔ ابتداءِ اسلام سے لے کر آج تک اس کی اہمیت برقرار ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ مولانا ندویؒ نے عربی زبان کی فضیلت واضح کرتے ہوئے اسے سیکھنے اور اس میں عبور حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے عربی زبان کی عظمت یوں واضح فرمائی:

> ''یہ قرآن، نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ اور داعیان اسلامؒ کی زبان ہے، جنھوں نے اس زبان کے ذریعہ پوری دُنیا میں دین کو پھیلایا اور بے شمار زحمتیں اُٹھائیں، جس کے باعث دونوں جہاں میں سرخرو ہوئے۔ ...... اُردو، فارسی اور دیگر زبانیں حالات کے لحاظ سے عروج وزوال کا شکار ہوسکتی ہیں، کوئی زبان رہے یا نہ رہے عربی زبان قیامت تک باقی رہے گی۔ خود اس ملک میں بھی جب تک مسلمان اور اسلام ہے عربی زبان زندہ رہے گی۔''(۳۳)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ برصغیر پاک وہند کے عظیم لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھی فروغ زبان عربی کے لیے ترغیب دی اور لوگوں کو احساس دلایا کہ دین فہمی اور قربِ رسولؐ حاصل کرنے کے لیے بہترین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذریعہ عربی زبان کا فہم لازم وملزوم ہے۔ یہ زبان ہمارے آباؤ اجداد کی زبان ہے اور ہجرت کے بعد ہم اپنی اصل زبان کو فراموش کر چکے ہیں۔ سید ابو الحسن علی ندویؒ بھی ان کے ایک رسالہ "المقالة الوضية فى النصيحة و الوصيحة" کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ اُنھوں نے اس رسالہ میں تحریر فرمایا ہے کہ عربی زبان کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے ہونے کی وجہ سے اس کی درس وتدریس دارین میں سعادت مندی کا باعث ہے اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے منتخب فرمایا ہے:

> ''ہم پردیسی لوگ ہیں، ہمارے آباء واجداد نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔نسب اور زبان کی عربیت ہمارے لیے سرمایۂ فخر ہے کہ یہی ہمارے لیے سیدُ الاولین و الاخرین، افضل الانبیاء و المرسلین، مفخر وجود صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کا ذریعہ ہے......ہم میں سے خوش نصیب وہ ہے جس کو عربی زبان، اس کی صرف ونحو اور کتب ادب سے حصہ ملا ہو، اور اس کو حدیث وقرآن سے واقفیت ہو، ہمارے لیے حرمین شریفین کی حاضری اور ان کے ساتھ تعلق خاطر بھی ضروری ہے، یہی ہماری سعادت کا راز ہے اور وہ کم نصیب اور محروم ہے جو اس سے روگردانی کرتا ہے۔''(۳۴)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ عربی زبان وادب کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ انہیں اس بات کا بھرپور ادراک تھا کہ عربی زبان نہ صرف دینی علوم کے حصول کا ذریعہ ہے بلکہ جدید عصری علوم میں بھی مہارت حاصل کرنے کا باعث ہوسکتی ہے لہٰذا مسلمانان برصغیر پاک وہند کو عربی زبان سیکھنے کی بھرپور جدوجہد کرنا چاہیے تاکہ دینی وعصری علوم میں مہارت حاصل کی جاسکے۔طلبہ کو اس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

> ''عربی زبان اس وقت ایک زندہ اور طاقت ور زبان ہے، عرب ملکوں میں وہ اپنے عروج اور شباب پر ہے۔ وہ تصنیف وتالیف، خطابت وتقریر، سیاست وصحافت، علم وفلسفہ اور دستور وقانون کی زبان ہے اور وہ پورے طور پر نکھر گئی ہے۔''(۳۵)

برصغیر پاک وہند میں عمومی طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ عربی زبان سیکھنے کا مقصد صرف ترجمہ کی صلاحیت حاصل کرنا ہے جبکہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ طلبہ کو ترغیب دیتے ہیں کہ عربی زبان وادب کے حصول میں محنت اور لگن کے ذریعے اپنا لوہا منوایا جائے اور عربی زبان بھرپور میں مہارت کے ذریعے ایسی کارکردگی کا مظاہرہ کیا جائے جو دیگر افراد کے لیے قابل تقلید نمونہ بن سکے۔

> ''ہر جگہ اس علم کی قدر ہے بشرطیکہ آپ نے اس میں کوئی کمال حاصل کیا ہو۔لیکن کمال کس کو کہتے ہیں، کمال شُد بُد کو نہیں کہتے، کمال ''کان یکون'' کو نہیں کہتے۔ کمال اس کو نہیں کہتے کہ آپ عربی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبارت پڑھ لیں اور اس کو سمجھ لیں، اس کا نام کسی نے بھی کمال نہیں رکھا۔ کمال وہ ہے جسے کہتے ہیں کہ ''جادو وہ جو سر چڑھ بولے''، کمال وہ ہے جو اپنا اعتراف کرالے۔''(۳۶)

عرب وعجم میں رابطہ بذریعہ عربی زبان:

قدیم زمانے سے عرب مبلغین دنیا کے کونے کونے میں اشاعتِ اسلام کے لیے سفر کرتے رہتے تھے۔ برصغیر پاک و ہند کے باشندوں کے دلوں میں ایمان وعمل کی روشنی انہی عرب مبلغین کی بدولت نصیب ہوئی۔ ان ہی کے دم قدم سے برصغیر پاک و ہند میں آج ہر طرف اسلام کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ علمائے متقدمین کی عظیم الشان کتب کا ذخیرہ بھی عربی زبان میں دستیاب ہے۔ ان بنیادی کتب کی تفہیم کے لیے عربی زبان کی تعلیم اشد ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عصر حاضر کے عرب باشندے اسلام کا پیغام بھلا چکے ہیں اور انہیں اب تبلیغ اسلام کی ازسرِنو ضرورت ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ان علماء متقدمین کی مساعیٔ جمیلہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''بلاشبہ اگر وہ مبلغین نہ ہوتے، ان کا جہاد نہ ہوتا، ان کی سچائی اور دیانت داری نہ ہوتی، ان کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی نہ ہوتی تو اس علاقہ میں یہ دین نہ پھیلتا جس کے نام پر ہم ملتے ہیں۔ نہ یہ اسلامی اخوت ہوتی جس کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔ نہ یہ قرآنی عربی زبان ہوتی جو عرب وعجم میں افہام وتفہیم اور تبادلۂ خیال کا وسیلہ ہے اور جس کو وہ اپنی نسلی زبانوں پر فوقیت دیتے ہیں۔''(۳۷)

عرب اقوام اور قبائل کے مختلف لہجوں کے باوجود ان سب کا ایک عربی زبان پر اتفاق اُمت مسلمہ کے لیے نہایت ہی خوش آئند بات ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کو بھی اپنی مختلف زبانوں اور لہجوں کی وجہ سے کسی ایک زبان پر متفق ہونا محال ہے لہٰذا ایک عربی زبان کو قومی اور بین الاقوامی رابطہ کی زبان کے طور پر اپنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ برصغیر کی زبانوں اور عربی زبان کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کے تحتی براعظم میں زبانوں کی تعداد پندرہ ہے، اس میں بعض مستقل زبانیں بھی ہیں جن کے بولنے والوں کو ترجمان کی ضرورت پڑتی ہے یا انگریزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن جزیرۃ العرب کا اپنی وسعت اور قبائل کی کثرت کے باوجود شروع سے طرۂ امتیاز رہا ہے کہ ظہورِ اسلام سے اس وقت تک اس کی ایک ہی مشترک زبان عربی ہے۔''(۳۸)

سید ابوالحسن علی ندویؒ کی دوربین نگاہ ان آثار واحوال کا مطالعہ کر رہی تھی جو مسلمانوں کے زوال اور ابتری کا باعث بن رہے تھے جن میں سے اپنی زبان وثقافت سے دوری بھی شامل تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے دل کی آواز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درد مند دلوں تک پہنچانے کے لیے ایک کتاب تحریر کرنے کا ارادہ کیا جس میں عربی زبان کی اہمیت کو اُجاگر کیا جاسکے۔خصوصاً اہل عرب کے لیے جو اس وقت دیگر یورپی زبانوں سے مرعوب ہوکرعربی زبان سے روگردانی کر رہے تھے۔ایسے افراد کومسلمانوں اورعربوں کے عظیم الشان ماضی کی یاد دلاکرعربی زبان وادب کی طرف راغب کیا جاسکے تاکہ اس کی پیروی کرتے ہوئے ایک عظیم مستقبل کا حصول ممکن ہوسکے۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اُس کتاب کی تحریر کا باعث بننے والے محرکات کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس ملک و ماحول سے مصنف کا تعلق تھا اور جہاں اس کتاب کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا تھا، اس کا اقتضا تھا کہ یہ کتاب اس ملک کی زبان (اُردو) میں تصنیف کی جائے لیکن ایک خیال کے ماتحت اس کتاب کی تصنیف کے لیے اُردو کے مقابلہ میں عربی کو ترجیح دی گئی۔عربی زبان کی ترجیح و انتخاب کا محرک و باعث یہ احساس تھا کہ عرب ممالک اس احساس کمتری اور مرض خودفراموشی کا سب سے زیادہ شکار ہیں، دُنیا نے اگرچہ انہیں سے نئی زندگی اور ایمان پایا ہے، لیکن آج انہیں کی فضا سب سے زیادہ خاموش اور انہیں کا سمندر سب سے زیادہ پرسکون ہے......عرب اپنی تاریخ اور اپنے جغرافیہ کے اعتبار سے اس کے اہل ہیں کہ بین الاقوامی سیادت سنبھالیں اور پوری متمدن دُنیا پر اثر ڈالیں۔ان کے ممالک بحراحمر اور بحرمتوسّط کے کنارے واقع ہیں۔وہ مغرب اورمشرق بعید کے درمیان میں ہیں۔ نئے عالمگیر انقلاب اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے عرب ممالک اور مشرق اوسط سے زیادہ موزوں سرزمین کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ یہ سب اسباب ومحرکات تھے جن کی بنا پر ہندی نژاد مصنف نے عربی زبان کو اس اہم موضوع کے لیے انتخاب کیا۔اور یہ کتاب سب سے پہلے عربی میں لکھی گئی جس کا نام ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' تھا۔''(۳۹)

طلبہ کی سہولت کی خاطر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی متعدد کتب کے تراجم خود کیے تاکہ طلبہ ان کی مدد سے اصل عربی کتب کو سمجھنے میں سہولت محسوس کریں اور عربی سیکھنے میں دلچسپی بھی لیں۔

''تصنیف کے علاوہ مولانا کو ترجمہ پر بھی بے مثال قدرت حاصل تھی۔ ماذاخسر العالم، القادیانی و القادیانیہ وغیرہ کا اردو ترجمہ بھی مولانا نے خود ہی کیا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید کے رسالۂ توحید کو مولانا نے عربی میں منتقل کیا۔علامہ اقبال کے متعدد قصائد کا بھی عربی میں ترجمہ فرمایا۔اس کے علاوہ ترجمہ کے سلسلہ میں مولانا کے اور بھی قابل قدر کام ہیں۔''(۴۰)

فلاح امت کے اس احساسِ مروت کے پس منظر میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے دل میں وہ اخوت و بھائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چارہ تھا جس کی بنیاد نبی محترم ﷺ نے مواخاتِ مدینہ کے موقع پر رکھی اور تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دے دیا، خواہ ان کا تعلق کسی رنگ و نسل یا علاقہ سے ہو۔ علاوہ ازیں آپ نے تمام مسلمانوں کو ایک جسم کی مانند قرار دیا کہ اگر جسم کے کسی عضو میں تکلیف ہو تو پورا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ اہل عرب کو اس جسم میں دل کی حیثیت حاصل ہے اور اس دل کی دھڑکن نبی محرمؐ ہیں۔ لہٰذا عرب اور عربی زبان سے تعلق قائم رکھنا ایمان کی مضبوطی کی علامت اور رسول اللہؐ کے ساتھ محبت کا اظہار ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''مسلمان عالم عربی کو اس حیثیت سے دیکھتا ہے کہ وہ اسلام کا گہوارہ ہے، انسانیت کی پناہ گاہ ہے، عالمی قیادت کا مرکز ہے، روشنی کا مینار ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان، اس کے عزت وافتخار کا عنوان، اس کا سنگ بنیاد ہیں۔ اگر اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جدا کر دیا جائے تو اپنے تمام قوت کے زخیروں اور دولت کے چشموں کے باوجود اس کی حیثیت ایک بے جان لاشہ اور ایک نقش بے رنگ سے زیادہ نہ ہوگی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جن کی وجہ سے عالمِ عربی عالمِ وجود میں آیا۔''(۴۱)

اسلامی اخوت و بھائی چارے کے فروغ اور عربی و عجمی کے فرق کو کم کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی بھرپور جدوجہد سے ندوۃ العلماء لکھنوء نے **كلية الغة العربيه** کا آغاز ۱۹۹۶ء میں کیا جہاں عربی زبان وادب کی تدریس کا خصوصی اہتمام تھا۔ جس میں متعدد مرتبہ عرب ممالک کی نامور شخصیات کو مختلف تقریبات میں شرکت کے لیے مدعو کیا جاتا۔ اس كلية الغة العربيه کی افتتاحی تقریب میں آنے والے مہمانوں میں سے عالمِ عرب کے ممتاز خطیب و معلم علامہ یوسف القرضاوی نے اپنے خطاب میں ندوۃ العلماء کے زیر انتظام اس عظیم الشان ادارہ کی فروغ عربی زبان وادب کے لیے کی جانے والی کوششوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''انتہائی مسرت کی بات ہے کہ ایک عجمی ملک میں (وہ بھی ہندوستان کی سرزمین پر) عربی زبان و ادب کی تعلیم کے لیے ایک پورا ادارہ موجود ہے۔ صحابہ کرامؓ جب کسی ملک کو فتح کرتے تو اسلام، عربی زبان اور اسلامی تہذیب پھیلاتے تھے۔ چنانچہ اسلام کی بدولت تمام ملکوں کی زبان عربی ہو گئی۔ مصری اپنی قبطی زبان بھول گئے، وہاں کی عیسائی آبادی بھی عربی بولتی ہے۔ عربی زبان کی خدمت کرنے والے بھی زیادہ تر عجمی تھے۔''(۴۲)

فتنۂ قادیانیت کے خلاف ۱۹۹۷ء میں ندوۃ العلماء لکھنوء میں ایک عالمی اجتماع منعقد ہوا جس کے انتظام و انصرام میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ پیش پیش تھے۔ اجلاس کی صدارت حرمین شریفین مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے منتظم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعلیٰ شیخ محمد بن عبداللہ السبیل نے کی۔ بے شمار مندوب عرب ممالک سے تشریف لائے جس کی بناء پر اس عظیم الشان اجتماع میں عرب وعجم کے درمیان اخوت کی بہترین مثال نظر آتی تھی۔ مقامی لوگوں کی سہولت کے لیے عربی تقاریر کو اردو میں ترجمہ کرنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا تا کہ ان عرب مندوبین کے افکار ونظریات کو بہتر طور پر سمجھا جاسکے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس تاریخی اجتماع کی منظر کشی کرتے ہوئے رقمطراز ہوتے ہیں:

> ''ان حضرات کی آمد نے اجلاس کو ایسا بنا دیا جیسے کسی عرب ملک میں ہو رہا ہو۔اس کی کارروائیاں بھی عربی میں ہوتی رہیں جن کا ترجمہ اُردو میں کیا جاتا تھا اور اُردو کا عربی میں۔ ہندوستان کے تقریباً تمام ہی صوبوں کے علماء ومفکرین، مدارس اسلامیہ اور قدیم و جدید دارالعلوموں کے مہتمم اور دینی دعوت کے تجربہ کار اور بحث وتحقیق کے شناور تشریف فرما تھے۔تقریباً ۱۷ ملکوں کی نمائندگی تھی۔''(۴۳)

تدریس عربی کی ترغیب:

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس ساری صورتِ حال سے واقف و آگاہ ہونے کے باوجود عربی زبان و ادب کے طلبہ کو مایوس ہونے کی بجائے پُرعزم رہنے اور علم و عمل کے ذریعہ اپنی ذات میں کمال پیدا کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ کیونکہ ہر زمانہ میں عروج اور مرتبہ انہی اشخاص کو ملتا ہے جنہوں نے لگن اور جستجو کے ذریعہ منزل کو پانے کے لیے تگ و دو کی۔ زمانہ ہر وقت خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔اسلاف میں جو نامور شخصیات نے نام کمایا ہے تو اپنی جدوجہد سے۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ عربی زبان وادب کے طلبہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

> ''انسان کا ذاتی جوہر اور اس کی قابلیت ہی وہ چیز ہے جو ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر آپ نے ان تینوں چیزوں یعنی اخلاص، جذبۂ قربانی اور ذاتی جوہر حاصل کر لیا ہے تو زمانہ آپ کے لیے بدلا بالکل نہیں ہے اور ہر وقت آپ کے لیے چشم براہ ہے۔لیکن ان صفات سے اگر کوئی خالی ہے تو وہ جہاں بھی جائے گا اور جس جگہ کی بھی سند یا ڈگری اس کے پاس ہوگی، حالات کو بدلا ہوا اور اپنے مخالف پائے گا۔ پھر میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے یہ صفات اپنے اندر پیدا کر لیں تو آپ کے لیے عالمگیر کا زمانہ، نظام الملک طوسی کا زمانہ اور امام غزالیؒ، امام رازیؒ، امام ابن قیمؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا زمانہ آج بھی منتظر ہے اور وہ آپ کے لیے واپس ہوسکتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ زمانے میں کوئی جگہ پہلے سے خالی ہو اور وہ کسی کے لیے منتظر ہو کہ جب وہ شخص فارغ ہو لے گا تو اس کو وہ جگہ مل جائے گی۔ زمانہ ''بقائے اصلح'' کا قائل ہے۔ وہ بہت ہی حساس اور نقاد ہے۔ وہ صالح کی بجائے اصلح اور نافع کی بجائے انفع کو ترجیح دیتا ہے۔لہٰذا اگر آپ اپنے اندر یہ

© rasailojaraid.com